پنجابی شاعری
اور
تحریک پاکستان

حفیظ الرحمٰن

نیشنل انسٹیٹیوٹ آف پاکستان اسٹڈیز
قائداعظم یونیورسٹی
اسلام آباد
2000

Punjabi Poetry And Pakistan Movement

By
Hafeez-ur-Rehman

A dissertation submitted to
Quaid-i-Azam University, Islamabad
In partial fulfillment of the requirements
For the degree of Master of Philosophy in Pakistan Studies

National Institute of Pakistan Studies
Quaid-i-Azam University
Islamabad
Y2K

National Institute of Pakistan Studies
Quaid-i-Azam University
Islamabad

PIPS M. LIBRARY
Quaid-i-Azam University
Reference Section

FINAL APPROVAL

This is to certify that we have read the thesis submitted by **Mr. Hafeez-ur-Rehman** and it is our judgement that this thesis is of sufficient standard to warrant its acceptance by Quaid-i-Azam University, Islamabad, for the degree of Master of Philosophy in Pakistan Studies.

Committee

1. Supervisor
   Prof. Fateh Mohammad Malik
2. External Examiner
3. Director
   Prof. Dr. Haider Sindhi
   National Institute of Pakistan Studies
   Quaid-i-Azam University,
   Islamabad
   29/8/2000

انتساب

"آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام"

اظہار تشکر

میری تمام تر محنت، جوش اور جذبے کے پیچھے میرے مقالے کے نگران پروفیسر فتح محمد ملک کی محبت، شفقت اور خندہ پیشانی کا ہاتھ ہے۔ اس ڈیڑھ سالہ دور مشقت میں ملک صاحب نے ہمیشہ میرا بھرپور ساتھ دیا اور میں جہاں کہیں بھی مواد کی تلاش میں گیا، چاہے لاہور ہو یا اسلام آباد، میرے لئے ملک صاحب کا نام حوالہ بنا اور تمام احباب نے پذیرائی کی۔

پروفیسر ڈاکٹر حیدر سندھی کی معاونت ہمیشہ میرے شامل حال رہی۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔

ان کے بعد میں اردو، پنجابی کے دانشور، محقق، مصنف اور شاعر جناب احمد سلیم اور تنویر احمد میر صاحب کی عظمت کو سلام کرنا چاہوں گا جن کے سر پر میں رات دن سوار رہا۔ انہوں نے محض زبانی مجھے راستہ نہیں دکھایا بلکہ ایک مشاق رہبر کی طرح میری انگلی پکڑ کر مجھے چلنا سکھایا۔ بلاشبہ ان کے تعاون کے بغیر اس تحقیق کا اختتام پذیر ہونا مشکل تھا۔

میں اپنے استاد راشد حسن رانا کا بہت مشکور ہوں جنہوں نے مجھے پنجابی ادب کی طرف راغب کیا اور ساتھ ساتھ مجھے پنجابی ادب کی قد آور شخصیات سے متعارف کروایا۔ جن میں ایک معتبر نام الیاس گھمن کا ہے۔

الیاس گھمن، لاہور، کے پاس جب میں تحقیقی مواد کیلئے پہنچا تو نہ صرف انہوں نے مجھے اپنی طبع شدہ کتب عنایت کیں بلکہ ذاتی لائبریری ہی مجھے اٹھا کے دے دی جو میں نے آج تک ان کو واپس نہیں کی اس تعاون کیلئے میں

ان کا بہت مشکور ہوں۔

ڈیپارٹمنٹ میں لطیف ملک کا میں بہت شکر گزار ہوں۔

لائبریری کے سٹاف جناب ڈوگر صاحب، اسلم اور میر افضل کے بھرپور تعاون کا مشکور ہوں۔

لاہور میں جن بزرگوں نے میری حوصلہ افزائی کی ان میں آصف خان، نجم حسین سید، شفقت تنویر مرزا، رؤف شیخ، شہباز ملک، سائیں اختر، راجا رسالو، پروفیسر عاشق راحیل، انور چودھری، سبط الحسن ضیغم اور حکیم موسیٰ امرتسری شامل ہیں۔ تمام احباب کا میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

نوجوان ادیبوں اور شاعروں میں جنید اکرم، نثاور چدھڑ، افضل ساحر، طارق گوجر، سلطان کھاروی، زاہد صدیقی، زاہد حسن، عاشق علی فیصل، خالد (کتاب ترنجن) اور دوسرے دوست شامل ہیں۔ ان سبھی لوگوں کے تعاون کا شکریہ۔

والد بزرگوار ملک غلام جیلانی، والدہ، بھائی خلیل اعوان، حمید اللہ ملک اور باجی نسیم، رشیدہ، فاطمہ اور بچوں صدف، اقصیٰ، سدرہ، فواد، بشریٰ، قریبہ اور اسامہ کا مشکور ہوں جو ہمیشہ میری ترقی کیلئے دعاگو ہیں۔

اسلام آباد میں میں چوہدری الطاف کا مشکور ہوں جو اکثر و بیشتر مجھے مقالے کی چیکنگ کے مراحل میں ابواب کی ترسیل کیلئے اپنی گاڑی پر لے جایا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ قیصر، مسعود، ندیم، منظور، طارق اور لوگی کا بھی شکریہ۔

حسان اور ارشد کا اس مقالے کی جلد بندی میں مالی تعاون کا شکریہ۔ ان کے علاوہ زاہد، سرفراز، احمد، منیر، مظہر اور ساجد کا بھی شکر گزار ہوں۔

حفیظ اعوان

فہرست

	ابتدائیہ	۳
پہلا باب	مزاحمت اور پنجابی شاعری-- تاریخی پس منظر	۱۲
دوسرا باب	غلامی کا آغاز اور اس کے خلاف مزاحمت (۱۸۴۹-۱۸۳۹)	۴۴
تیسرا باب	۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور پنجابی شعری مزاحمت	۶۵
چوتھا باب	غلامی کی نصف صدی اور پنجابی مزاحمت (۱۸۵۷-۱۹۰۰ء)	۸۹
پانچواں باب	پگڑی سنبھال جٹا سے غدر گونج تک	۹۹
چھٹا باب	جلیانوالہ باغ اور پنجابی شاعری	۱۲۲
ساتواں باب	ہجرت سے خاکسار تک۔ تحریک آزادی کا عبوری دور (۱۹۲۰-۱۹۴۰ء)	۱۴۹
آٹھواں باب	تحریک پاکستان اور پنجابی شاعری (۱۹۴۰-۱۹۴۷ء)	۱۶۶
نواں باب	اختتامیہ	۱۷۴
	ضمیمہ جات	۱۸۱
	کتابیات	

ابتدائیہ

پنجابی شاعری میں مزاحمت اور حب الوطنی کی روایت

جب ہم "شاعری اور مزاحمت" کے لفظ ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں تو ہم اس بنیادی نکتے کو بھول جاتے ہیں کہ اپنے مفہوم اور کردار کے اعتبار سے یہ دونوں لفظ ایک ہی ہیں اس لئے جب ہم ان کا ایک ساتھ استعمال کرتے ہیں تو دراصل دو ہم معنی لفظوں کو اکٹھا استعمال کرنے کی غلطی کرتے ہیں۔ ہم "شاعری اور مزاحمت" کہہ کر دراصل "شاعری اور شاعری" یا "مزاحمت اور مزاحمت" کہہ رہے ہوتے ہیں اپنی بات کی وضاحت کے طور پر ہم کہنا چاہیں گے کہ شاعری میں مزاحمت کا مفہوم پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ اپنے عہد کا سچا شعر ہر سطح پر مزاحمتی شعر ہوتا ہے۔ اگر وہ مزاحمت نہیں کرتا تو وہ شعر نہیں ہوتا۔ یہ مزاحمت سماجی اور مجلسی سطح پر ہو یا معاشی اور سیاسی سطح پر۔ اسی طرح جب ہم "شاعری اور حب الوطنی" کی ترکیب استعمال کرتے ہیں تو پہلے والی غلطی دہراتے ہیں۔ کوئی سچا شعر یا فن پارہ حب وطن کے جذبے سے عاری نہیں ہوتا۔ عظیم ترین بین الاقوامی شاعری بھی' دراصل زمین اور مٹی کی محبت سے سرشار ہونے کے بعد ہی دوسری زمینوں اور ان کی مٹی سے محبت کی حامل ہو پاتی ہے۔ اس پہلو سے شاعری مزاحمت اور حب الوطنی کے بنیادی جذبوں سے عاری نہیں ہو سکتی۔ شیکسپیئر سے وارث شاہ اور والٹ وہٹمین تک اور اقبال سے نرودا اور فیض تک' انسانی شعر کی تاریخ میں یہ دو بنیادی جذبے ہمیں سب سے نمایاں نظر آتے ہیں۔

اس بحث کو اگر ہم پنجاب اور پنجابی کی روایت کے ساتھ جوڑنے کی کوشش کریں تو ہم دوبارہ اسی دلچسپ غلطی کا شکار ہوتے ہیں۔ اگر پنجاب کی تاریخ پر ایک سرسری سی نظر بھی ڈالی جائے تو فوراً ہی نظر آ جاتا ہے کہ پنجاب کی سرزمین بنیادی طور پر بیرونی حملوں اور یلغاروں کی تاریخ رہی ہے۔[1] اس کے ساتھ ہی یہ بیرونی حملہ آوروں سے نبرد

آزما رہنے کی تاریخ بھی ہے۔ آئندہ ابواب میں ہم اس بحث کی تفصیلات میں جائیں گے کہ کیا پنجاب نے واقعی بیرونی حملوں کی مزاحمت کی یا وہ بیرونی حملہ آوروں کو آسانی سے قبول کرتا رہا۔[۲] لیکن یہاں' پنجابی شاعری کے ضمن میں بابا فرید سے وارث شاہ اور بلھے تک اور پھر نو آبادیاتی پنجاب میں شاہ محمد سے بابو فیروز الدین شرف تک ہمیں منگولوں' ترکوں' افغانوں اور انگریزوں کے خلاف یہ مزاحمت قدم قدم پر دکھائی دیتی ہے۔ یوں پنجابی شاعری اور مزاحمت بھی دراصل ایک ہی مفہوم ادا کرتے ہیں۔

پنجابی شاعری' مزاحمت اور تشخص

اس بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے' ہم بعض دیگر ہم معنی لفظوں اور اصطلاحوں کا ذکر کریں گے جو پنجابی شعر و ادب کے حوالے سے گذشتہ چند برسوں میں کثرت سے استعمال ہوتی رہی ہیں۔ جیسے پنجابی تشخص' مزاحمت اور تشخص' تشخص اور ہیرو۔ ان اصطلاحوں کے ساتھ طول طویل مباحث دیکھنے میں آئے ہیں۔ ایک طرف نجم حسین سید' شفقت تنویر مرزا' آصف خان اور احمد سلیم کے نام نظر آتے ہیں جنھوں نے ان نکتوں پر بحث کرتے ہوئے کئی نئے سوالات اٹھائے۔ دوسری طرف غیر ملکی دانشوروں میں سرے برایاکوف (روسی) اور کرسٹوفر شیکل (انگریز) اور پاکستانی دانشوروں میں فتح محمد ملک اور ڈاکٹر طارق رحمان نے ان مسائل کی طرف توجہ کی۔

ان تمام بحثوں سے جو بنیادی مسائل ابھر کر سامنے آئے' انہیں مزید دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے حصے میں پنجاب کو پاکستان کی حقیقت سے ماوراء ایک الگ تھلگ جزیرے (یا بعض رومان پسند دانشوروں کے لفظوں میں "تاریخی طور پر ایک خودمختار مملکت) کے طور پر دیکھا گیا اور اس طرز فکر کی ترجمانی سرے برایاکوف' کرسٹوفر شیکل' نجم حسین سید' شفقت تنویر مرزا' آصف خان' احمد سلیم اور ان کے بعض نوجوان پیروکار اقبال قیصر' سعید بھٹہ اور جمیل احمد پال کرتے ہیں۔[۳] یہ دانشور ادب میں پنجاب کی "پاکستانی حقیقت" کو نظرانداز کرتے ہوئے "غیر حقیقی پنجابی تصوریت" پر اصرار کرتے ہیں مثلاً وہ پنجاب کی سیاسی تقسیم کو تو کسی حد تک تسلیم کر لیتے ہیں لیکن مذہب کی بنیاد پر اس کی ثقافتی اور تاریخی وحدت کو تقسیم کرنے کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ پنجاب کی تاریخ

کو ہندو، مسلمان یا سکھ پنجاب کی صورت میں نہیں دیکھتے اور اصرار کرتے ہیں کہ پنجابی ادب میں کوئی دو قومی نظریہ موجود نہیں ہے۔ لیکن خود ان کے اپنے اندر تضاد کی کیفیت ہے مثلاً ایک ہی طرح کے دعووں کے باوجود نجم حسین سید اور احمد سلیم دو الگ الگ انتہاؤں پر کھڑے دکھائی دیتے ہیں۔

ان کے برعکس الگ الگ سطح پر اور اپنے اپنے زاویہ نظر کے باوجود فتح محمد ملک اور ڈاکٹر طارق رحمان، پنجابی ادب، اس کی ادبی روایات، تاریخ اور موجودہ صورت حال کو خالص پاکستانی تناظر میں دیکھتے ہیں۔[۴] فتح محمد ملک کی مختصر سی انگریزی کتاب "پنجابی تشخص" پنجابی ادب کی نشاۃ ثانیہ کے سوال کو پاکستانی تناظر میں دیکھتی ہے اور سیالکوٹ کا راجہ رسالو، شیخوپورہ کا دلا بھٹی اور ساہیوال کا احمد خان کھرل پنجابی روح کے حامل ایسے پاکستانی نظر آتے ہیں جن کا بنیادی حوالہ اسلام بنتا ہے۔ (پاکستان میں اس دلچسپ بحث کو بھی فتح محمد ملک نے متعارف کروایا کہ راجہ رسالو ہندو تھا یا مسلمان۔ اور وہ تاریخی حوالوں سے سیالکوٹ کے راجہ رسالو کو مسلمان ہونے کی سند عطا کرتے ہیں) فتح محمد ملک کا کہنا ہے کہ پنجابی تشخص، پاکستانی تشخص سے باہمی ربط و ضبط قائم کئے بغیر موجود نہیں رہ سکتا۔ یہ تشخص (پنجابی) آگے بڑھے گا کیونکہ اس کے علاوہ کوئی دوسرا متبادل موجود نہیں ہے۔

یہاں ایک تیسرے مکتب فکر کا ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ ادبی اور دانشورانہ سطح پر یہ مکتب فکر، فتح محمد ملک کا پیروکار نظر آتا ہے لیکن دلیل کی بجائے، ادعا پر زور دینے اور تاریخی مغالطوں کو خلط ملط کرنے کے باعث علمی سنجیدگی اور متانت سے محروم ہے۔ تاریخی سطح پر یہ دو قومی نظریئے کو تنگ نظری کا جامہ پہنا کر پیش کرتا ہے۔[۵] اور پنجابی شاعری سے تمام غیر اسلامی حوالے نکالنے پر مصر ہے۔[۶]

پنجابی ادب کی مزاحمتی روایات کے حوالے سے، مختلف مکاتب فکر کے جداگانہ نقطۂ ہائے نظر کے باوجود، مذکورہ بالا تمام محققین، مورخین اور دانشور اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ مزاحمت اور حب وطن ہی پنجابی شاعری کا بنیادی وصف رہے ہیں اور یہی پنجابی تشخص کی بنیاد بھی ہیں۔ گویا پنجابی شاعری میں حب الوطنی، مزاحمت اور تشخص جیسی تمام اصطلاحیں، ایک نکتے پر آ کر ہم معنی اور یکجا ہو جاتی ہیں۔

دستیاب ادب کا جائزہ

گذشتہ صفحات میں ہم نے چند خاص حوالوں سے بعض کتابوں اور مصنفین کا ذکر کیا ہے جو زیر نظر تحقیقی مقالے کا اہم حوالہ بن سکتے ہیں لیکن مذکورہ حوالوں سے قطع نظر بھی ایسا بے شمار ادبی مواد دستیاب ہے جن کے گہرے مطالعے اور چھان پھٹک کے بعد ہی ہم اپنے موضوع سے انصاف کر سکیں گے۔ ہم ایسے دستیاب ادب کا ہر باب کے تناظر میں الگ الگ پیش کریں گے۔

پہلے باب-- میں تاریخی پس منظر سے بحث کے لئے کئی طرح کے ماخذ دستیاب ہیں۔ پنجاب کی قدیم ادبی روایات کے حوالے سے انگریزی زبان میں اعلیٰ علمی کتابوں کا گرانقدر ذخیرہ موجود ہے۔ خصوصاً قدیم آریائی پنجاب کے تاریخی شاہکار رگ وید میں پنجاب کے دریاؤں پر کشتی بانی کرتے ہوئے گائے گئے گیتوں کے تراجم درجنوں انگریزی کتابوں میں ملتے ہیں بعض تراجم اردو میں بھی دستیاب ہیں۔ پھر پنجاب کے میدانوں میں پشاچی زبان میں مرتب شدہ کہانیوں کی کتاب "وڈ کہا" (عظیم کہانی) کو پنجاب کا اولین ادبی شاہکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ پشاچی میں اب یہ کتاب بالکل ناپید ہے تاہم اس کے سنسکرت ترجموں "برہت کتھا" اور "کتھا سرت ساگر" کا سراغ ضرور مل جاتا ہے۔ "کتھا سرت ساگر" کا ترجمہ انگریزی زبان میں Ocean of Story کے نام سے دس جلدوں میں موجود ہے۔

مزاحمت اور احتجاج کی آوازوں یعنی ناتھ جوگیوں کی شاعری کا حوالہ سب سے پہلے موہن سنگھ نے اپنی معروف کتاب History of PunJabi Literature میں دیا۔ یہ کتاب تقسیم سے قبل لاہور سے شائع ہوئی تھی۔ ناتھ جوگیوں کی احتجاجی شاعری کے حوالے اب انگریزی زبان میں چھپنے والی پنجابی ادب کے بعض تذکروں میں مل جاتے ہیں تاہم یہ تمام ماخذ ثانوی نوعیت کے ہیں اور اس دور کے حوالے سے بنیادی ماخذوں تک ہماری رسائی نہیں ہو سکی۔ پنجابی میں وار گوئی کا آغاز بھی کم و بیش اسی دور میں ہوا۔ ان واروں کا موضوع اخلاقی مزاحمت سے عبارت ہے۔ ان واروں کے بعض اقتباسات پنجابی ادب کے جدید تذکروں میں مل جاتے ہیں لیکن ان کی نوعیت بھی ثانوی ماخذوں کی ہے۔ پنجابی تصوف اور پنجابی صوفی شاعروں کے ملفوظات اور شاعری کے مجموعے' ہمارے اولین بنیادی ماخذ ہیں-- بابا فرید اور شاہ حسین کے درمیانی عرصے میں اسماعیلی پیروں کا کلام' سکھ گورو صاحبان کا کلام' سلطان باہو' بلھے

شاہ، وارث شاہ، میاں محمد بخش، خواجہ فرید اور اس دور کے بعض اہم اور غیر اہم شاعروں کا کلام دستیاب ہے جس کا براہ راست مطالعہ اس باب کے لئے انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے ساتھ ہی فارسی، پنجابی اور اردو میں مسلمان صوفیاء کے ملفوظات بھی تاریخی پس منظر کا بنیادی ماخذ بنتے ہیں۔ اس دور سے متعلق واروں، ڈھولوں، لوک داستانوں اور لوک گیتوں کے مجموعے بھی ہمیں اس دور کے بارے میں براہ راست تاریخی مواد فراہم کرتے ہیں۔ ثانوی ماخذوں کے طور پر ہم پنجابی ادب کے ان تنقیدی اور تاریخی تذکروں پر بھی نظر ڈالیں گے جو پنجابی شاعری کے مزاحمتی عناصر کی نشاندہی کرتے ہیں۔

دوسرا باب پنجاب پر برطانوی قبضے سے چند برس پیشتر سے شروع ہو کر ۹-۱۸۴۸ء کی ملتان کی بغاوت کا احاطہ کرتے ہوئے ۱۸۴۹ء میں پنجاب پر انگریزی قبضے تک کا احاطہ کرتا ہے۔ اس باب کے لئے بھی خاصا بنیادی مواد دستیاب ہے۔ پنجابی شاعر شاہ محمد کی طویل نظم "جنگ ہند پنجاب" اہم ترین بنیادی ماخذ ہے۔ اس نظم کا مستند مواد اور اس پر متعدد تبصرے آسانی سے مل جاتے ہیں۔ اپنے مطالعے کے لئے ہم نے محمد آصف خان کے مرتب کردہ متن کو بنیاد بنایا ہے۔ اسی باب میں ملتان کے دیوان مولراج کی بغاوت کے بارے میں ایک ملتانی وار کا متن بھی بنیادی ماخذ کے طور پر موجود ہے جس سے اس بغاوت کے بارے میں مقامی مسلمان روایات پر روشنی پڑتی ہے۔ اس وار کا متن عمر کمال خان ایڈووکیٹ کی مرتب کردہ کتاب "ملتانی واراں" میں دستیاب ہے۔ انگریزی نقطۂ نظر سے اہم بنیادی ماخذ ایڈورڈز کی کتاب A Year on the Punjab Frontier ہے جس میں ملتان کے ہندو حکمران پر متعدد الزامات عائد کئے گئے ہیں۔ ایک اور بنیادی ماخذ دیوان مولراج کے مقدمے کی روداد ہے جو Trial of Diwan Mulraj کے عنوان سے چھپی تھی اور اب بھی دستیاب ہے۔ اس باب میں بعض ثانوی ماخذوں کو بھی استعمال کیا جائے گا۔

تیسرا باب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے بحث کرتا ہے جس میں ان گنت بنیادی ماخذوں کو زیر بحث لایا جائے گا۔ ان میں انگریزی رپورٹیں، برطانیہ سے مارکس اور اینگلز کے مراسلے، جو نیویارک ہیرلڈ ٹریبیون میں چھپتے رہے اور فارسی، اردو اور انگریزی میں چھپنے والے مقامی اخبارات وغیرہ شامل ہیں۔ اس باب کا اہم ترین حصہ ساہیوال کے احمد خان کھرل کی بغاوت اور اس کی شخصیت کے حوالے سے گائے جانے والے لوک ڈھولوں پر مشتمل ہے۔ مقالہ نگار

کو ان ڈھولوں کے متعدد مجموعے شائع شدہ صورت میں دستیاب ہو چکے ہیں۔ ساہیوال کے علاوہ جھنگ اور بعض دیگر علاقوں کی بغاوتوں کے بارے میں بھی بنیادی ماخذ موجود ہیں۔

چوتھا باب ۱۸۵۷ء سے انیسویں صدی کے اختتام تک مسلم اور غیر مسلم پنجابی مزاحمتی تحریکوں سے عبارت ہے۔ اس دور میں سرسید کے زیر اثر اصلاحی اور تعلیمی کام کے سبب پنجاب کے مسلمانوں نے عمومی طور پر انگریز مخالف کارروائیوں سے اجتناب کیا لیکن اس دور کے ضبط شدہ پنجابی قصوں کہانیوں اور شاعرانہ ادب کے مطالعے سے سکھوں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی اکا دکا مزاحمتوں کا سراغ بھی ملتا ہے۔ یہ ضبط شدہ کتابیں اس دور کا اہم ترین اور بنیادی ماخذ ہیں۔ اس دور میں سکھوں کے ایک فرقہ-- نامدھاری فرقہ-- نے انگریزوں سے براہ راست ٹکر لی۔ اس حوالے سے تخلیق ہونے والی شاعری کا بیشتر حصہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔ اس باب کی بنیاد اسی ضبط شدہ بنیادی ماخذوں پر ہو گی۔

پانچواں باب پنجاب کی پہلی عظیم کسان تحریک--- پگڑی سنبھال جٹا--- سے "غدر گونج" تک کے واقعات کا احاطہ کرتا ہے۔ یہ تحریک ۱۹۰۰ء کے انتقال اراضی ایکٹ میں ترمیم کے نتیجے میں پھوٹ پڑی تھی۔ تحریک کی قیادت میں ہندو، مسلمان اور سکھ تینوں فرقوں کے نمائندے تھے لیکن باغی کسانوں کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ اس تحریک کے بارے میں بہت کم شاعرانہ مواد دستیاب ہے لیکن جتنا بھی دستیاب ہے اس کی مدد سے اور اس دور کے اہم انگریزی روزنامہ "پنجابی" لاہور میں چھپنے والے مواد کے اضافے سے ہم اس تحریک کا جائزہ لیں گے۔ اس تحریک سے قبل بیسویں صدی کے اوائل کی بعض دوسری تحریکوں کا بھی احاطہ کیا جائے گا۔

یہی باب ریشمی رومال تحریک، غدر تحریک اور پہلی عالمی جنگ کے دوران فوجی بھرتی کے خلاف پنجاب کی مزاحمت کے حوالے سے تخلیق کی جانے والی شاعری اور لوک گیتوں کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس بنیادی ماخذ کے ساتھ ساتھ معاصر اخباری حوالوں، انگریزی ریکارڈ اور خفیہ پولیس کی رپورٹوں سے بھی مدد لی جائے گی۔ اس باب میں ۱۸-۱۹۱۳ء کے دوران بحق سرکار ضبط ہونے والی شاعری کو بھی زیر بحث لایا جائے گا۔

چھٹا باب جلیانوالہ باغ امرتسر میں جنرل ڈائر کی اندھادھند فائرنگ اور سینکڑوں مسلمانوں اور غیر مسلم پنجابیوں کی

ہلاکت کا حال بیان کرے گا۔ اس میں ہم عصر انگریزی ریکارڈ، ہنٹر کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کی رپورٹوں کے ساتھ ساتھ اس موضوع پر لکھی جانے والی شاعری اور عوامی قصوں کا بھی احاطہ کیا جائے گا۔ جلیانوالہ باغ کے قتل عام کے حوالے سے سینکڑوں کتابیں اور کتابچے دستیاب ہیں۔ اسی طرح پنجابی شاعری کا دامن بھی اس موضوع سے خاصا مالا مال ہے۔

"ہجرت سے خاکسار تحریک تک" کے عنوان سے یہ زیر نظر تحقیقی مقالے کا ساتواں باب ہو گا۔ اس میں ۱۹۲۰ء۔۴۰ کے دور کا احاطہ کیا جائے گا۔ یہ دور تحریک آزادی کے حوالے سے خاصا بھرپور اور جاندار ہے جس میں عدم تعاون، ہجرت، خلافت، کمیونسٹ، نوجوان بھارت سبھا اور کسان تحریکوں کے حوالے سے ضبط تحریر میں آنے والی شاعری کے ساتھ ساتھ لوک شاعری اور عوامی قصوں کا بھی جائزہ لیا جائے گا۔ ان بنیادی ماخذوں کے علاوہ برطانوی پنجاب کی خفیہ ایجنسیوں اور دیگر سرکاری اداروں کے ریکارڈ کی مدد سے انگریزی نقطۂ نظر پر بھی روشنی ڈالی جائے گی۔ بھگت سنگھ کے حوالے سے قائداعظم محمد علی جناح کی اسمبلی میں تقریر، گاندھی۔ اروِن معاہدے کی دستاویزات، بھگت سنگھ کی پھانسی میں گاندھی جی کے خاموش کردار اور پھانسی کے بعد کانگریس کے کراچی اجلاس میں نوجوان بھارت سبھا سمیت کانگریس اور دیگر سیاسی جماعتوں کا احتجاج بھی اپنی مناسب جگہ پر زیر بحث لائے جائیں گے۔

مقالے کا آٹھواں باب تحریک پاکستان کے حوالے سے ۱۹۴۰ء۔۴۷ کے دور کا احاطہ کرے گا۔ یہ باب ۱۹۴۰ء کی قرارداد لاہور کے نقطۂ آغاز سے شروع ہو کر ۱۹۴۷ء میں قائداعظم کی رہنمائی میں پاکستان کے حصول تک شاعرانہ شہادتوں کا احاطہ کرے گا۔ ہماری دسترس میں ایسی متعدد نظمیں ہیں جن میں قرارداد لاہور، مسلمان کی بیداری، یونینسٹ پارٹی کی ہندی مسلمانوں سے غداری، مسلم لیگ، دو قومی نظریہ، ابو الکلام آزاد کی ہندو دوستی، خضر حیات، قائداعظم محمد علی جناح، خاکسار اور احرار کی پاکستان دشمنی، شملہ کانفرنس، خضر حیات کا استعفیٰ اور اسی طرح کے دیگر موضوعات پر ہم عصر پنجابی شعراء نے کھل کر اظہار کیا ہے اور ان کے شعری مجموعے آسانی سے دستیاب ہیں۔ ان شعراء میں ملک لال دین قیصر، خواجہ عبدالرحیم عاجز، استاد کرم امرتسری، ظہیر نیاز بیگی، استاد عشق لہر، مولانا محمد بخش مسلم، طالب جالندھری، بابا کمالا، عبدالغفور اظہر، صحرائی گورداسپوری، اللہ دتہ ناظر، حکیم شیر محمد ناصر، شیر افضل جعفری، اسماعیل متوالا اور مولا بخش کشتہ سمیت درجنوں نام لئے جا سکتے ہیں۔

تاریخی طور پر حملہ آوروں کے سامنے کبھی نہیں جھکا۔ وہ پورس سے بھگت سنگھ، نظام لوہار اور ملنگی تک متعدد مثالیں پیش کرتے ہیں۔

۳۔ روسی مصنف سرے برایا کوف کی کتاب پنجابی لٹریچر (انگریزی)، کرسٹوفر شیکل کے مقالے، خصوصاً پنجابی اینڈ لاہور (انگریزی)، نجم حسین سید دیاں کتاباں "ساران" "تخت لہور" "اک رات راوی دی" (پنجابی)، شفقت تنویر مرزا دیاں کتاباں "پنجابی ادب میں مزاحمتی موضوعات (انگریزی)، اور پنجابی ادب (پنجابی ادبی بورڈ لہور)، آصف خاں دیاں کتاباں "جنگ ہند پنجاب" تے "نک سک" (پنجابی)، باقی مصنفین کی تخلیقات، اوپر (حوالہ 1) میں ذکر ہو چکا ہے۔

۴۔ فتح محمد ملک، پنجابی تشخص (انگریزی) لاہور، ....، ڈاکٹر طارق رحمان، پاکستان میں لسانی سیاست (انگریزی)، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، کراچی، ۱۹۹۶ء

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار، جدوجہد آزادی میں پنجاب کا کردار (اردو)، لاہور، 1996ء

۶۔ ڈاکٹر شہباز ملک، تحریک پاکستان اور پنجابی ادب (اردو)، لاہور، ۱۹۸۳ء، پنجابی ادب تے منزل پاکستان (پنجابی)، لاہور، ۱۹۹۵ء

پہلا باب

مزاحمت اور پنجابی شاعری-- تاریخی پس منظر

پنجابی ادب و شعر کی روایت، تمام عالمی ادبی روایات کی طرح، انسان دوستی، حب الوطنی اور مزاحمت کی روایت سے عبارت ہے۔ پنجاب میں اولین انسانوں کے پہلے قدموں سے ہی اس روایت کا آغاز ہو گیا تھا جو قدم بہ قدم تاریخ کے صفحات پر اپنے نشانات ثبت کرتے ہوئے آج عالمی ثقافت اور انسانی تہذیبی ورثے کا ایک قابل فخر حصہ ہے۔

قدیم ترین حوالے

پنجابی ادب کی جڑیں قدیم ماضی میں ہیں۔ رگ وید کے گیتوں کا قدیم ترین حوالہ ہمیں یونانی مورخ اریانوس (۹۵-۱۷۵) کی یادداشتوں میں ملتا ہے۔ سکندر کی ہندوستان پر حملے کی مہم پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے، وہ یہاں کے باشندوں کے رسم و رواج کا بھی ذکر کرتا ہے۔ اپنی کتاب کے دسویں باب میں وہ لکھتا ہے: "وہ بھی کہتے ہیں کہ ہندوستانی اپنے مرے ہوؤں کی یادگاریں تعمیر نہیں کرتے کیونکہ ان کی یاد کو زندہ رکھنے کے لئے، ان کے کارنامے اور ان کی یاد میں گائے جانے والے گیت ہی کافی ہیں۔"[۱]

آریہ پنجاب میں کب اور کیسے آئے اور انہوں نے مقامی باشندوں یا دراوڑوں کو کیسے مطیع کیا اور کس طرح فاتح اور مفتوح تہذیبوں کے امتزاج سے وادی سندھ کی ایک نئی تہذیب ابھری جو وادی گنگ و جمن کی تہذیب سے علیحدہ اور منفرد تھی، یہ تاریخی مباحث کثرت سے بیان کی گئی ہیں۔ انہیں ہم یہاں دہرانے کی بجائے صرف ان واقعات کا تذکرہ کریں گے جن کے گرد رگ وید کی نظمیں گھومتی اور تاریخ کے پہیئے کو گھماتی ہیں۔ ہم ان مباحث سے بھی

صرف نظر کرنا چاہیں گے جو وادی سندھ کی ماقبل تہذیب سے عبارت ہیں۔

اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہڑپہ تہذیب سے بھی قبل کی تہذیب خود پنجاب کے بعض دوسرے علاقوں میں موجود تھی۔ خصوصاً ساندل بار کے علاقے ننکانہ صاحب سے دو میل کی مسافت پر "کھڈیاں والا" ایسے قدیم ترین آثار کی نشاندہی ہوئی ہے جسے کوٹ ڈیجی کے تہذیبی آثار کے مماثل قرار دیا جا سکتا ہے۔ احمد غزالی کے لفظوں میں "کوٹ ڈیجی کی نوع کا یہ پہلا کھنڈر ہے جو اس علاقے میں دریافت ہوا ہے۔ اب تک پاکستان میں کل ۵۴ اور ہندوستان میں ۱۵ کوٹ ڈیجی کی نوع کے کھنڈرات دریافت ہوئے ہیں۔ ان میں سے چالیس کھنڈرات بہاولپور میں واقع ہیں اور چودہ--- کوٹ ڈیجی، جلیل پور، ہڑپہ، سرائے کھولا، جھنگ، بسر، کھنڈا، پنڈی نوشہرہ، ہتھیال (سرکپ)، گوملا ہتھالا، رحمان ڈھیری، لیوان، ترکائی قلعہ اور اسلام چوکی کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔"[۲] اس کے ابتدائی ہڑپائی تہذیب نے پنجاب کو شہری طرز زندگی سے روشناس کیا۔

پنجاب کا ایک اور شہر دیپالپور بھی اپنی قدامت کے اعتبار سے پچیس ہزار سال پرانا ہے۔ میاں اللہ دتہ نسیم سلیمی، اے سی داس کی معروف کتاب "رگ ویدک انڈیا" کے حوالے سے دعویٰ کرتے ہیں کہ "اس خطے کی مشہور بستیاں دیپالپور، اجودھن (پاک پتن) اور قبولہ کی تہذیبیں پچیس ہزار سال پرانی ہیں اور صرف پانچ ہزار سال تک کے تاریخی حقائق کسی حد تک معلوم ہو سکے ہیں۔"[۳]

منشی گنیش داس "چہار باغ پنجاب" میں لکھتے ہیں کہ راجہ سالباہن اور راجہ رسالو سے صدیوں پہلے سیالکوٹ آباد ہو چکا تھا۔ چندر بنسی خاندان کے راجہ شل نامی پنجاب اور قندھار کا رخ کیا اور دریائے راوی اور چناب کے درمیان ایک شہر آباد کیا جس کا نام شل کوٹ یا سل کوٹ تھا جو بعد میں سیالکوٹ کے نام سے مشہور ہوا۔ راجہ شل نے سورج بنسی، رکھ بنسی اور جام قوم کے جموال کو اس علاقہ سے نکال کر تمام پنجاب پر اپنی حکومت قائم کر لی۔ راجہ شل معرکہ پانی پت میں مارا گیا۔ یدھشر نے اس کے علاقہ پر قبضہ کر کے اس کے نابالغ بیٹے راجہ امل کھیم دت کو اس علاقے کا حاکم بنا دیا۔ مسلسل چھ سو سال تک اس علاقہ کی حکمرانی راجہ شل کے خاندان میں رہی۔[۴] اس خاندان سے راجہ جموال نے حکومت چھینی اور گجرات سمیت ۲۲ پشتوں تک اس علاقے پر حکمرانی کی۔

مالائی روایات کی روشنی میں لکھا ہے کہ قدیم ایام میں ملتان کے قریب راشٹر کوٹ (شورکوٹ) برہمن گڑھ (جھنگ) اور چندا کوٹ (چنیوٹ) آباد تھے اور رام چندر جی اور لچھن کے باپ راجا دشترتھ کی ایک بیوی رانی کیکئی راوی اور چناب کے درمیانی علاقے پر حکمران راجا اسوا پتی کی بیٹی تھی جو رام چندر کی سوتیلی ماں تھی اور چودہ برس کا بن باس کاٹ کر آنے پر انہوں نے اپنی سوتیلی ماں کے چرن اسی علاقے میں سرائے سدھو میں چھوئے چنانچہ راوی کے کنارے قدیم الایام سے لچھمن کنڈ' سیتا کنڈ اور رام چونترہ کے مندر موجود ہیں جہاں برس کے برس بہار کے موسم میں بیساکھی کا میلہ لگا کرتا تھا۔ مندر کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ بالمیکی رامائن میں لکھا ہے کہ ان تینوں محترم شخصیتوں نے اسی علاقے سے دریائے چناب میں کشتیوں کا سفر کیا اور کشمیر پہنچے۔ رامائن میں لکھا ہے کہ ایراوتی کے شمال میں ایک آریا ہندو بستی علاقے کے جھانگ یا درختوں کے جھنڈ میں موجود تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ یہی بستی علاقے کے جھانگ یا درختوں کے جھنڈ میں موجود تھی۔ کچھ بعید نہیں کہ یہی بستی بعد میں جھنگ کہلائی۔ انہی زبانوں میں دریائے چناب کا نام ہندو آریائی کہانیوں اور روایات میں چندر بھاگ بھی بیان کیا گیا ہے۔ رگ وید میں اس علاقے میں ایک قبائل حکمران ورچھی دن اور ایک سردار در شکھ کے درمیان ہونے والی ایک جنگ کو بھی نظم کیا گیا ہے۔ ورچھی دن کے بیٹے یعنی افراد قبیلہ تیروں کے شکار ہوئے تین ہزار آریا جنگجوؤں نے دریائے ویہات (جہلم) کے کنارے یہ جنگ لڑی۔ جھنگ کی مقامی آبادی میں آج بھی دریائے جہلم کو ویہت ہی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ ممکن ہے رچنا کے علاقے میں یہ آریا' دراوڑ کی آخری مڈبھیڑ ہو۔ آریا سرداروں کا نام ابھیاورتن چھایامن بتایا گیا ہے جو دیوادت کا بیٹا تھا اور کسی پرتھو نامی مشہور آریا سردار کی نسل سے تھا جو خود پارتھو قبیلے کا سردار تھا۔ کسی آریا شاعر کے اندر دیوتا کو مخاطب کر کے لکھے گئے ایک طویل گیت کی کچھ سطریں یوں ہیں اور یہ رگ وید کی چھٹی کتاب کا ستائیسواں گیت ہے:

"اے گھون اندر تیری عظیم طاقتوں کا نظارہ ہماری آنکھوں نے اس وقت کیا

جب تو نے در شکھ کی اولاد کو قتل کیا

جب تیری نیچے کو لپکتی ہوئی برق کی صرف آواز سن کر ہی

ان دشمنوں کے دلیر سورمے ہلاک ہو گئے

مکھون نے ابھیا ورتن چھایا من کی مدد کی اور در شگھ کا تخم تباہ کر دیا

ہری یوپیا میں تو نے ور چھی ون کا ہراول تباہ کر دیا

اور پیچھے کے فوجی مارے دہشت کے فرار ہو گئے

زرہ بکتر پہنے تین ہزار آریا سومے و یہت کے کنارے

شہرت پانے کی خاطر جمع ہوئے

ور چھان کے بیٹے تیر کھا کھا کر گرے

اور تباہ ہو جانے والی کشتیوں کی طرح برباد ہو گئے۔"[۱۰۰]

ہزاروں سال قبل دو ہی صورتیں ممکن ہیں کہ یا تو و یہت یا و ستا یعنی دریائے جہلم ہری یوپیا یا موجودہ ہڑپہ کے قریب سے گزرتا ہوا یا پھر ہری یوپیا نامی شہر ہی اس علاقے میں واقع ہو جہاں آج دریائے جہلم پہنچتا ہے اور یہ علاقہ جھنگ ہے۔ بہرحال آریاؤں نے مقامی آبادیوں کو طویل مقابلوں کے بعد تہ تیغ کیا' ان کی عورتوں سے شادیاں کیں اور جو بچ گئے انہیں داسا' یا داسیو یا داس اور شودر کا نام دے کر اپنی معاشرتی اور مجلسی زندگی میں سب سے نچلا درجہ دے دیا۔ رگ وید میں لکھا ہے:

"سوم رس کے ان قطروں میں اندر نے داسو کو تباہ کیا اور ہمیں ان کی نفرتوں سے آزاد کیا تاکہ ہم خوراک ذخیرہ کر سکیں۔"

مقامی عورتوں کے بارے میں لکھا ہے:

"ان کی عورتیں گلیوں اور بازاروں اور دندناتی پھرتی ہیں۔ انہوں نے پھولوں کے ہار پہن رکھے ہیں اور نیم عریاں رہتی ہیں۔ وہ گھوڑوں کی طرح ہنہناتی ہیں اور حماموں کی طرف بھاگتی ہیں۔"[۱۰۱]

آریائی شاعروں نے اپنی نظموں میں جہاں مفتوح دراوڑوں کے بدصورت ہونے' ان کی عورتوں کی کردار کشی کرنے اور آریائی مذہب سے ان کی بیزاری اور نفرت کو ہدف کا نشانہ بنایا۔ وہاں انہوں نے نئی سرزمین سے اپنا رشتہ

جوڑتے ہوئے ست سندھو کے دریاؤں، پہاڑوں اور میدانوں کی عظمت کو سلام بھی کیا۔ ان منتروں سے ہم اس عہد کے پنجاب کی تاریخ، جغرافیہ اور معاشرت کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر ویدک سنسکرت کو موجودہ پنجابی کی ابتدائی شکل مان لیا جائے تو رگ وید پنجابی ادب کی پہلی کتاب قرار دی جا سکتی ہے۔[۱۲]

پنجاب میں آریوں کے ورود کے بعد، اس علاقے پر بیرونی حملوں کا آغاز ہوا۔ اس دھرتی پر سب سے پہلے مصر کے فرعون بادشاہ اوسیرس نے حملہ کیا۔ وہ ایران کے راستے پنجاب میں داخل ہوا۔ تہذیب اور فن کے دیئے بجھاتا وہ آندھی کی طرح واپس لوٹا ہی تھا کہ شام کی ملکہ سمیرامس نے پنجاب پر حملے کی جرات کی۔ پچھلے حملے کے زخم تازہ تھے اس لئے پنجابیوں نے اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ اس بار حملہ آوروں کو پریشان اور تباہ حال واپس لوٹنا پڑا۔ ملکہ زخمی حالت میں صرف بیس لوگوں کو بچا کر لے جا سکی۔ یہ بارہ سو قبل مسیح کا زمانہ تھا۔ تیسرا حملہ مصر کے ہی ایک اور فرعون بادشاہ سیسوسٹریس نے کیا۔ پنجاب کو روندتا اور گنگا کی وادی کو پچھاڑتا وہ بنگال جا پہنچا۔ ۵۳۸ ق۔ م میں ایران کے شہنشاہ سائرس نے پنجاب پر چڑھائی کر دی لیکن وہ بھی شام کی ملکہ کی طرح زخمی حالت میں یہاں سے ناکام و نامراد لوٹا۔ اس کے ساتھ صرف سات سپاہی زندہ بچ کر جا سکے۔ اس کے پیچھے پیچھے دارائے ایران چڑھ دوڑا۔ وہ تباہی پھیلاتا اور زندگی اور حسن کو تباہ کرتا، جہاں سے آیا تھا، وہیں لوٹ گیا۔ ہم نے یہاں صرف چند بڑے بڑے حملوں کا ذکر کیا ہے۔ چھوٹے حملے کسی شمار قطار میں ہی نہیں تھے۔ پنجابیوں کے لئے یہ صدیاں گویا زندگی اور موت کے درمیان ہونے والی ہمہ وقت جنگ کی صدیاں تھیں۔ ہر وقت حملے کی زد میں رہنے اور اس کی مزاحمت کرنے کے باعث ان کے مزاج میں ایک سختی جیسی آنے لگی۔[۱۳] یہ صورت سکندر مقدونی کے حملے تک ہی نہیں بلکہ اس کے بعد بھی صدیوں تک جوں کی توں برقرار رہی۔

سکندر کا حملہ

سکندر کے حملے کے حوالے سے اب تک سیکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ پنجاب پر سکندر کے حملے کے موضوع پر بھی درجنوں کتابیں چھپ کر ناپید بھی ہو چکی ہیں اور درجنوں نئی کتابیں بھی چھپ رہی ہیں اس لئے پنجاب

پر یونانی حملے کے باب میں ہم ایسی معلومات پیش کرنے سے قاصر ہیں جو پہلے ہی سامنے نہ آ چکی ہوں۔ البتہ مقامی روایات اور لوک ادب کے ذریعے کئی ایسی کہانیاں سامنے آ رہی ہیں جن کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہو گا۔ یہ کہانیاں اٹک اور پوٹھوہار سے لے کر جہلم، گجرات، شیخوپورہ، پنڈی بھٹیاں، جھنگ اور ملتان تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ان لوک روایات کی ادبی حیثیت اگرچہ نہ ہونے کے برابر ہے لیکن بعد میں پنجابی شاعری اور ادب میں مزاحمت کی جو روایات در آئیں، وہ انہی ابتدائی کہانیوں کی مرہون منت ہیں۔

کہتے ہیں کہ ۳۲۶ ق م کے آغاز میں سکندر اعظم ایک لاکھ بیس ہزار پیادہ اور پندرہ ہزار سواروں پر مشتمل لشکر لے کر باجوڑ کے راستے سوات سے ہوتا ہوا صوابی کے قریب دریائے اٹک کے کنارے خیمہ زن ہوا۔ دریائے اٹک کے دائیں کنارے گھنا جنگل تھا جس میں شیر دہاڑتے اور ہاتھی چنگاڑتے یہاں سے سکندر نے ہاتھی پکڑوائے۔ انہیں آہنی زنجیروں میں جکڑ کر سدھایا اور اپنی فوج میں شامل کر لیا کیونکہ اسے اطلاع مل چکی تھی کہ جہلم کے اس پار راجہ پورس ہاتھیوں کا بریگیڈ لئے کھڑا ہے۔ یونانی لشکر نے تربیلا سے کچھ اوپر دریا کو عبور کرنے کی خاطر اسی جنگل سے وافر لکڑی حاصل کر کے کشتیاں بنوائیں۔ وہ مقام جہاں سکندر نے کیمپ لگایا اٹک گاؤں سے سولہ میل اوپر اوہند تھا۔ یہاں یونانی دیوتاؤں کے نام پر قربانیاں دی گئیں۔ شہسواری کے مظاہرے ہوئے۔[۱۴] اس روایت کی اگرچہ کوئی تاریخی سند نہیں ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اسی طرح جب سکندر اٹک سے ٹیکسلا کی طرف بڑھا تو بعض مقامی اور چند ایک تاریخی روایات کے مطابق سکندر کا مشہور چیتا گھوڑا اس علاقے میں آ کر مر گیا اور سکندر اعظم نے اس گھوڑے کی یادگار کے طور پر یہاں ایک عظیم الشان سٹوپہ بنوایا۔ یہ سٹوپہ مانکیالہ کے قریب اب تک موجود ہے اور شاہراہ اعظم کے ذریعے راولپنڈی سے لاہور جاتے ہوئے پندرھویں میل پر سڑک کے مشرق کی طرف دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس سٹوپہ کی تعمیر کے متعلق بعض دوسرے قصے بھی مشہور ہیں۔[۱۵]

پوٹھوہار میں داخل ہوتے ہی سکندر کو کسی مزاحمت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ ۳۲۶ ق م کے موسم بہار کی ایک سہانی صبح یونانی فوج نے دریائے اٹک کو عبور کرنا شروع کیا۔ یہ سلسلہ غروب آفتاب تک برابر جاری رہا۔ دریا کے پار راجہ

امبھی کے سواروں کا ایک دستہ پذیرائی کے لئے موجود تھا جس کے ساتھ تیس ہاتھی اور مہمانوں کی ضیافت کے لئے بے شمار بھیڑ بکریاں اور بیل بھی تھے۔ دو تین روز بعد سکندر ٹیکسلا پہنچا۔ امبھی نے خود شہر سے باہر آ کر اسے خوش آمدید کہا اور بھیر پہاڑی کی طرف لے گیا۔ شہر کے دروازے یونانی سپاہیوں کے لئے کھول دیئے گئے۔ مقامیوں کے دو رویہ کھڑے ہجوم نے تحیر کے ساتھ اجنبی لشکر کو اپنے کوچہ و برزن میں داخل ہوتے دیکھا۔[16]

دم لے کے چلنے کی خاطر سکندر اعظم کو بہت دنوں ٹیکسلا میں رکنا پڑا۔ اس دوران اس نے امبھی کی مہمان نوازیوں کا خوب لطف اٹھایا۔ یونانیوں نے اس شہر کو بغور چھان پھٹک کر دیکھا۔ مضافات کی سیر کی۔ انہوں نے شہر سے کوئی دس میل دور چند سادھوؤں کو دیکھا۔ جو ننگ دھڑنگ اپنے گیان دھیان میں مصروف تھے۔ لوگ ان کے حضور کورنش اور بندگی بجا لاتے اور انہیں انتہائی واجب الاحترام خیال کرتے۔ سکندر اعظم تک بھی ان کا احوال پہنچا تو اسے ان سے ملنے کا اشتیاق ہوا۔ مگر خود ان کے پاس چل کر جانا شایان شان نہ تھا اس لئے اپنے ایک قاصد "اینی کرٹس" کو بھیجا۔ شہر سے دس میل دور یہ پندرہ نفوس بالکل برہنہ بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ دھوپ کی تمازت سے زمین اتنی تپ رہی تھی کہ ننگے پاؤں چلنا دوبھر تھا۔ ترجمان کی وساطت سے گفتگو ہوئی اور کرٹس نے انہیں بتایا کہ یونانی فاتح سکندر اعظم ان کے مسلک کے بارے میں معلومات کرنا چاہتا ہے۔ ان میں سے ایک سادھو نے ترش روئی کے ساتھ جواب دیا کہ مغربی لباس اور بوٹ سوٹ پہننے والا یونانی جب تک برہنگی اختیار کر کے تپتے پتھر پر آ کر نہ بیٹھے ہماری بات سمجھ نہیں سکتا--- دوسرے سادھو نے ذرا نرمی کے ساتھ کہا کہ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ سکندر جیسا فاتح ہمارے علم و فراست کی گہرائی کو جاننے کی خواہش رکھتا ہے لیکن وہ ہماری زبان سے نابلد ہے اور ترجمان کی وساطت سے ہماری تعلیمات کو سیکھنے کی کوشش ایسی ہے جیسے چشمے کے نتھرے پانی کو کیچڑ میں بہا دیا جائے کیونکہ عامی تک صرف الفاظ ہی پہنچ پاتے ہیں' الفاظ کے معانی کی روح تک رسائی ممکن نہیں۔"

پھر انہوں نے کرٹس سے یونانیوں کے طریق عبادت اور تپسیہ کے بارے میں سوالات کئے اور اثبات میں جواب پا کر بہت ہی خوش ہوئے لیکن اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ جہاں تک نروان کا تعلق ہے یونانی دانشوروں کے لئے لباس کا اہتمام اور کپڑوں کا بے تحاشہ استعمال ہی حجاب بنا ہوا ہے۔"[17]

راجہ امبھی کے اصرار پر ایک سادھو کو کپڑے پہنا کر سکندر کی خدمت میں لے جایا گیا۔ اس حرکت پر دوسرے سادھوؤں کو ناگواری ہوئی اور اس کو انہوں نے برا بھلا کہا۔

سکندر کی اس سادھو سے جو گفتگو ہوئی اس کی تفصیل کسی کتاب میں درج نہیں البتہ ایک اور یونانی آرسٹبلس ARISTOBULOUS اسی گروہ کے دو مہاتما سادھوؤں کے بارے میں لکھتا ہے-- "ایک کے سر پر لانبے بال اور دوسرے کا سر گھٹا ہوا تھا۔ ان دونوں کے چیلے چانٹے بھی تھے۔ جب کبھی یہ مہاتما منڈی اور بازار میں آتے لوگ ان کے درشن کرنے کو جمع ہو جاتے وہ جس فروختی جنس کو چاہتے بلاتکلف اٹھا لیتے۔ لوگ عقیدت کی راہ سے ان کے سروں پر روغن کنجد نچھاور کرتے جو ان کی آنکھوں تک بہہ نکلتا۔ کھانے کے لئے تل اور شہد ملا کر پیش خدمت کرتے۔ جس وقت بڑا مہاتما کسی جگہ تیز دھوپ میں دراز ہو جاتا' دوسرا ایک ٹانگ پر دن بھر اس کے سرہانے کھڑا رہتا---"

ٹیکسلا میں سکندر اعظم نے ایک دربار عام بھی لگایا جس میں راجہ امبھی کے علاوہ دوسرے مقامی سرداروں نے تحفے تحائف اور نذریں پیش کیں۔ سکندر نے بھی نوازش خسروانہ سے کام لے کر انعامات تقسیم کئے اور ان کے حدیقے اور جاگیروں میں توسیع کے فرمان جاری کئے۔ بالخصوص راجہ امبھی کو بہت سا قیمتی سازوسامان اور سونے چاندی کے برتن عطا کئے۔ یونانی افسروں کو سکندر کی یہ داد و دہش ایک آنکھ نہ بھائی اور ناقدانہ گفتار کا بازار گرم ہو گیا--- مگر صورت حال یہ تھی کہ سکندر اپنے تئیں نسلی امتیازات سے بالاتر ایک شہنشاہ عالم تصور کرنے لگا تھا جس کے سائے میں نسل انسانی کی سطح برابر ہو گئی تھی۔[18]

اس دوران ٹیکسلا میں ہی سکندر کے سپاہیوں میں ملیریا کی وبا پھوٹ پڑی۔ ملیریا کے علاوہ انہیں ہیضے کی وبا کا سامنا بھی کرنا پڑا۔ اب وہ آگے بڑھنے کے لئے تیار نہیں تھے اور بعض روایات کے مطابق یہیں سے لوٹ جانا چاہتے تھے۔ جب وبا کی شدت کچھ کم ہو گئی تو سکندر نے انہیں آگے بڑھنے اور پورس کی آزاد اور خود مختار ریاست کو اپنی فوجی طاقت سے غلام بنانے پر اکسایا۔ نوجوان اور مغرور سپہ سالار نے اپنے باپ کا واسطہ دیتے ہوئے انہیں پورس پر چڑھائی کے لئے آمادہ کر لیا۔ اس اثناء میں وہ پورس کو اطاعت کا پیغام بھیج کر اس کے جواب کا منتظر تھا۔

بعض مقامی روایات کے مطابق پورس نے سکندر کے پیغام کا بہت سخت لفظوں میں جواب بھیجا اور کہا کہ اس بات کا فیصلہ صرف میدان جنگ میں ہو گا کہ کون کس کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔

"مجھ سے بزدلانہ اطاعت کی امید مت رکھنا۔"

سکندر نے ٹیکسلا سے اپنی ایک ڈویژن فوج مع ساز و سامان جنگ اور کشتیاں جہلم کی سمت روانہ کر دیں اور خود سر راہ جہلم مارگلہ کی پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ مارچ کرتا ہوا نکلا۔ موجودہ راولپنڈی کے قریب اس کو مقامی سرداروں کی سخت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا اور لڑتا بھڑتا انہیں زیر کرتا ہوا آگے بڑھا۔ دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر پنڈ دادن خان کی جانب کیمپ لگانے کا حکم دیا۔ جو کیمپ کئی میل رقبہ پر محیط تھا۔ بائیں کنارے سے پورس کے دیکھ بھال کرنے والے دستوں نے یونانیوں کے خیمے ایستادہ دیکھے۔ انہوں نے شاہی محافظ دستوں کے زرق برق لباسوں کی سج دھج بھی دیکھی اور سکندر اعظم کو بھی اپنے افسروں کے درمیان چلتے پھرتے دیکھا۔ اسی ہجوم میں ٹیکسلا کے راجہ امبھی کے پانچ ہزار مسلح سپاہی بھی تھے جو یونانی حملہ آوروں کی کمان میں پورس کے خلاف لڑنے آئے تھے۔[19]

اب دونوں کے درمیان دریائے جہلم تھا۔۔ اس یلغار کی تفصیلات ہم تک ان پرچہ نویسوں کے ذریعے پہنچی ہیں جنہیں سکندر اپنے ساتھ لایا تھا لیکن پنجابی محقق سعید بھٹہ کی مدد سے دستیاب ہونے والی پورس کی وار' اور بعض دیگر لوک روایات سے پتہ چلتا ہے کہ سکندر نے اس موقع پر اپنے سپاہیوں کے سامنے انتہائی جذباتی تقریر کی جس کا ان پر خاطر خواہ اثر ہوا۔ سکندر نے دریا کہاں سے اور کیسے عبور کیا' اس کی تفصیلات ہمارے موضوع سے خارج ہیں۔ لیکن ان کہانیوں سے اس بات کی ضرور تصدیق ہوتی ہے کہ طوفان باد و باراں اور دریا کی طغیانی کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سکندر اور اس کی فوج خاموشی سے دریا کے پار اتر گئی۔

دریائے جہلم کے کنارے موجودہ جہلم شہر کی مسجد کی سیڑھیوں پر بیٹھے ایک بوڑھے ڈھاڈی عمر کی بیان کردہ کہانی کے مطابق جب پورس کو اس شبخون کا پتہ چلا تو اس نے اپنے بڑے بیٹے ہری رائے کو دو ہزار سپاہیوں کے ساتھ سکندر کا راستہ روکنے کے لئے روانہ کیا۔ ہری رائے بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا۔ عمر کے لفظوں میں "ہری رائے کی شہادت کے بعد اس کا دوسرا بیٹا آگے بڑھا اور وطن کے کام آیا۔"[20]

کے مقام پر جنگ کے دوران اسے جو زہر آلود تیر لگا بالاخر بابل تک پہنچتے پہنچتے اس کی موت کا باعث ٹھہرا۔ سکندر کا قبضہ پنجابی علاقوں پر بے حد مختصر مدت کے لئے رہا۔ سکندر نے باجوڑ کی راہ سے داخل ہونے کے بعد چترال، ٹیکسلا اور پنجاب کے علاقے فتح کئے اور پھر چناب اور راوی کے سنگم پر سرائے مدھو میں اپنے جرنیلوں کا ایک اجتماع بلایا جس میں اچ، شورکوٹ، چنیوٹ، منکیرہ، کوٹ کروڑ اور بھیرہ کے مقامی حکمران اور یونانی جرنیل شریک ہوئے۔[۲۵] لیکن اس کے ساتھ بغاوتوں کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اس کے جاتے ہی شورکوٹ نے یونانیوں کے خلاف بغاوت کر کے خود مختاری کا اعلان کر دیا۔

ملتان کی مقامی روایات کے مطابق سکندر جب ملتان پہنچا تو اس کی فوج نے حملہ کرنے یا آگے بڑھنے سے صاف انکار کر دیا۔ سکندر نے ہر چند اپنے فوجیوں کو اس مہم کی اہمیت جتلائی لیکن وہ سکندر کی والہانہ امنگوں کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہوئے اور واپس جانے پر اڑ گئے۔ اس طرح وہ فاتح اعظم جسے ایشیا اور یورپ کا کوئی حکمران شکست نہ دے سکا۔ اپنے ہی آدمیوں سے ملتان میں مات کھا گیا۔ بالاخر سکندر نے خود ہمت کی اور آگے بڑھا۔ شہر کے مضبوط دفاعی انتظامات نے سکندر اعظم کی کچھ پیش نہ چلنے دی۔ سکندر کی تگ و دو دیکھ کر فوج نے ارادہ بدل لیا اور اس شکار پر جھپٹ پڑی۔ سکندر نے سیڑھیاں لگا کر شہر پناہ کو سر کرنے کا حکم دیا۔ مگر قلعہ کے اندر تیروں کی اتنی بارش ہو رہی تھی کہ کسی کو اوپر چڑھنے کی جرات نہ ہوئی۔ چار و ناچار سکندر اعظم خود ہی ہمت کر کے ایک سیڑھی لگا کر فصیل شہر پر چڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ مگر ایک برج سے چلا ہوا تیر سکندر اعظم کی ڈھال کو چیرتا ہوا اس کے سینہ میں پیوست ہو گیا۔ یہ تیر ایک گز لمبا اور تین انگل موٹا تھا جو سینہ میں چار انگل گہرا اتر گیا۔ سکندر مضبوطی سے کھڑا مقابلہ کر رہا تھا۔ خون کثرت سے جاری تھا۔ آخر یہ اولوالعزم اور بہادر فاتح غش کھا کر گر پڑا۔ اس پر غضب کا رن پڑا۔ کسی نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ جس پر یونان کی فوج قلعہ میں داخل ہو گئی اور کشت و خون کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ سکندر کے طبیب کری ٹوڈوس نے اگرچہ اس کا یہ تیر نکال لیا۔ مگر وہ اس کے زہر کے اثر کو زائل نہ کر سکا۔ اس لئے اس زخم کے صدمہ سے واپسی پر سکندر بابل میں فوت ہو گیا۔ اس طرح ملتان پر حملہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔[۲۶]

جہلم اور دیگر دریاؤں کے باسی آج بھی مندرجہ ذیل پنجابی شعر گنگناتے سنائی دیتے ہیں :

قبراں وچ سکندر دی ماں رووے
بچہ موت سنیہوڑے آ گئے نی!
مائی توں کیہڑے سکندر نوں ڈھونڈی ایں
ایتھے لکھاں سکندر سما گئے نی[۲۷]

پورس کے دونوں بیٹے جنگ میں مارے گئے تھے۔ خود پورس کو کسی یونانی سردار نے قتل کر دیا۔ اس کی بیٹی منگلا دیوی، ایک درویش صفت عورت تھی، جس کے حوالے سے بدھ مت کا صوفیانہ رنگ نکھر کر سامنے آیا۔ منگلا کے علاقے میں، بعض بزرگ آج بھی اسے مائی منگلا کہہ کر، اس کی نیکی اور پریم بھگتی کے گیت گاتے ہیں۔ منگلا کا بیٹا (پورس کا نواسہ بجے سنگھ، اپنے نانا کی مملکت اور اس کے تخت و تاج کا وارث بنا۔ جہلم اور راولپنڈی کے درمیانی علاقے پر پورس کے بھتیجے سوبھنا بہادر کی عملداری تھی۔ سوبھنا اپنے چچا کی طرح بہادر اور صاحب کردار راجہ بتایا جاتا ہے۔

بدھ مت کے اثرات سے اولین پنجابی تصوف کی جو کونپلیں پھوٹیں۔ ایک پالی گیت کی مندرجہ ذیل سطریں قابل توجہ ہیں :

یہ دو پایہ (انسان) جو ناپاکی کا پتلہ ہے
بدبودار جسم اٹھائے پھرتا ہے
جس میں طرح طرح کی غلاظت بھری ہے
جو اس کے روئیں روئیں سے پھوٹی پڑتی ہے
اس طرح کے جسم کا مالک
جو اپنے آپ کو ارفع و اعلیٰ جانے
اور دوسروں کو ہیچ سمجھے

اگر یہ اس کی جہالت نہیں تو اور کیا ہے؟[۲۸]

ان صفحات میں بیان کردہ روایات اور لوک داستانیں تاریخی تضادات اور مغالطوں سے پر ہو سکتی ہیں۔ یہاں ان کی تاریخی حیثیت پر بھی اصرار نہیں ہے۔ ان کے بیان سے صرف اتنا واضح کرنا ضروری تھا کہ پنجاب نے تاریخ کے کسی بھی دور میں بیرونی حملہ آوروں کا ساتھ دینے یا مزاحمت نہ کرنے کی روش نہیں اپنائی۔ یونانی اثر کے تحت عالمی تاریخ میں سکندر کو سکندر اعظم اور پورس کو محض پورس لکھا ہے۔ پوری انسانی تاریخ میں کارل مارکس وہ واحد تبصرہ نگار ہے جس نے سکندر کو سکندر مقدونی اور پورس کو عظیم راجہ پورس کہہ کر ان کا ذکر کیا ہے۔[۲۹]

ناتھ شاعری، واریں اور مزاحمتی شاعری

"رگ وید کے بعد جو اہم ادبی کتاب پنجاب میں تصنیف ہوئی۔ وہ "وڈکہا" کہلاتی ہے۔ "وڈکہا" پشاچی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی پنجابی میں "وڈی کہانی" کے ہیں۔ اس کتاب کا مصنف گناڈھے ضلع جہلم کا رہنے والا تھا۔ یہ کتاب پشاچی زبان میں اب ناپید ہے۔ لیکن اس کے سنسکرت ترجمے موجود ہیں۔ کشمیر کے ایک پنڈت شمندرا نے "برہت کتھا" کے عنوان سے اسے سنسکرت میں ڈھالا۔ کشمیر ہی کے ایک اور پنڈت سوم دیو نے ان کہانیوں پر مبنی سنسکرت میں ایک کتاب "کتھا سرت ساگر" کے نام سے مرتب کی۔ "کتھا سرت ساگر" کا انگریزی ترجمہ Stary of Ocean کے نام سے ہو چکا ہے۔ سوم دیو نے نہ صرف اصل ماخذ "وڈکہا" کا حوالہ دیا ہے بلکہ واضح طور پر لکھا ہے کہ یہ کہانیاں سب سے پہلے پشاچی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ لسانیات کے بیشتر علماء اس بات پر متفق ہیں کہ موجودہ مغربی پنجاب پشاچی زبان کا گھر تھا لیکن کہانیوں کا یہ عظیم خزانہ پنجابی میں کسی زبردست ادبی روایت کو جنم نہ دے سکا۔[۳۰]

پنجابی شاعری میں احتجاج اور مزاحمت کی اولین اور نمایاں آوازیں ناتھ شاعری سے عبارت ہیں۔ ناتھ فرقے کی کہانی ہندوستان کی مذہبی تاریخ میں ایک اہم باب کا اضافہ ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تنترک، سادھ، سدھا اور ناتھ شاعروں کی صورت میں جلوہ گر ہوئے۔ کٹھن تپسیا کے بعد ناتھوں اور جوگیوں نے طلسماتی قوتیں حاصل کر لی

تھیں۔ عوام ان سے ڈرتے بھی تھے اور پیار بھی کرتے تھے۔ جوگیوں کی بنیادی کتاب پسنجلی کی یوگا درشن ہے۔ سدھا تعداد میں چوراسی اور ناتھ نو ہیں۔ سدھا ادب مگھدھی زبان میں ہے اور اس کا تعلق بدھ فرقے وجر۔یانا سے ہے۔ گورکھ ناتھ کو سدھ بھی تسلیم کیا جاتا ہے اور ناتھ بھی۔ اس کا تعلق پنجاب سمیت ہندوستان کے کئی علاقوں سے رہا ہے۔[۳۱] ٹلہ بالناتھ (جہلم) سے گورو گورکھ ناتھ نے قدیم ترین پنجابی شاعری کا آغاز کیا تھا۔[۳۲] ایک روایت کے مطابق ناتھ شاعری ۸۵۰ تا ۱۴۵۰ [۳۳] اور دوسری روایت کے مطابق گیارھویں سے چودھویں صدی عیسوی تک پھیلی ہوئی ہے۔[۳۴]

ناتھ جوگیوں کی شاعری ایک خیال کے مطابق ۸۵۰ء سے ۱۴۵۰ء تک پھیلی ہوئی ہے۔ ناتھ شاعروں نے مقبول پنجابی لوک گیتوں کی بنیاد پر اپنی نظمیں لکھیں۔ یہ شاعری اس دور کی مقبول لوک دھنوں میں گائی جاتی تھی۔ ناتھ شاعروں نے اپنے گیتوں میں احتجاج اور بغاوت کے رجحانات کی طرف اشارے کئے ہیں اور غالباً یہی روایت آگے چل کر پنجابی صوفی شاعری کی بنیاد بنی ہے۔ مگر ناتھ شاعری میں احتجاج اور بغاوت کے یہ اشارے روایتی انفرادیت پسندی سے آگے نہیں بڑھ سکے ہیں۔ ناتھ شاعر بدھ مت سے بے حد متاثر نظر آتے ہیں۔ ان کی تعلیمات برہمنی ذات پات اور مذہبی جکڑ بندیوں کے خلاف احتجاج سے بھری ہوئی ہیں۔ ناتھ شاعری نے انسانی شخصیت کے داخلی اور خارجی تصادم کو بھی اجاگر کیا ہے۔[۳۵]

ذہنی طور پر مسلمانوں سے بے حد قریب تھے کیونکہ ان کے عقیدے کے مطابق متعدد خداؤں کی پوجا درست نہیں تھی۔ اور وہ دل میں ہر وقت یاد الٰہی کو اہمیت دیتے تھے۔[۳۶]

کم و بیش یہی دور وار گوئی کا دور بھی ہے۔ وار گوئی مزاحمتی پنجابی شاعری کی قدیم ترین روایت اور پہلی معلوم پنجابی صف سخن ہے۔ وار کیا ہے؟ اس کا سیدھا سادھا جواب یہ ہے کہ جنگی واقعات کے منظوم بیان کو وار کہتے ہیں۔ لیکن اس سیدھے سادھے جواب کی تشریح سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ وار کب وجود میں آئی اور کون سے مختلف مراحل طے کر کے موجودہ شکل میں ہم تک پہنچی؟

وار پنجابی شاعری کی صدیوں پرانی صنف ہے۔ وار کی جو مختصر تعریف ہم نے اوپر بیان کی ہے۔ اس اعتبار سے تو

رگ وید کے ان منتروں کو بھی واروں کا نام دیا جا سکتا ہے' جن میں دراوڑوں اور آریاؤں کے درمیان طویل خونی جنگوں کا ذکر ملتا ہے۔ لیکن چونکہ یہ نظمیں وار کی مروجہ ہیئت اور طرز بیان سے مطابقت نہیں رکھتیں اس لئے ہم انہیں واروں کا نام نہیں دے سکتے۔ وار کب شروع ہوئی اس کے متعلق ہم کوئی دو ٹوک بات نہیں کہہ سکتے۔ سبحان رائے بٹالوی کی خلاصتہ التواریخ سے پتہ چلتا ہے کہ پنجابی شاعری کی یہ صنف امیر خسرو کے دور میں رائج تھی۔[۳۷] چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد کے وقت وار موجود تھی۔ "پنجابی لٹریچر" کے مصنف سرے برایاکوف کے مطابق آٹھویں سے دسویں صدی تک وار جنم لے چکی تھی۔ یہ دور ناتھ جوگیوں کی شاعری کا دور کہلاتا ہے۔ سرے برایا کوف نے اپنے اس دعوے کی تائید میں کوئی ٹھوس ثبوت نہیں دیا۔ پھر انہوں نے جن واروں کا ذکر کیا ہے۔ وہ ان کے نظریئے سے مطابقت نہیں رکھتیں۔ یوں لگتا ہے کہ موصوف نے ایک بندھے ٹکے نظریئے کے چوکھٹے میں ان لوک واروں کو فٹ کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً انہوں نے وار کے جنم کا بنیادی سبب بیرونی حملہ آوروں خصوصاً مسلمان حملہ آوروں کو قرار دیا ہے۔ لیکن ثبوت کے طور پر "ٹنڈے اسراج دی وار" "سکندر ابراہیم دی وار" اور کچھ دوسری واروں کو پیش کیا ہیے۔ ٹنڈے اسراج کی کہانی' پورن بھگت' رانی تکشیلا اور یوسف زلیخا کی کہانی سے بے حد ملتی ہے۔ جس کا بیرونی حملوں سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح "سکندر ابراہیم دی وار" دو مسلمان بادشاہوں کے درمیان جنگ کا حال بیان کرتی ہے اور دونوں کے درمیان وجہ نزاع ایک ہندو لڑکی ہے۔[۳۸]

لیکن سرے برایاکوف کے مفروضے سے اختلاف کے باوجود یہ ماننا ہی پڑے گا کہ وار کی ابتدا گورونانک کے عہد سے بہت پہلے ہو چکی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ گورو صاحبان نے جو واریں لکھیں ان کے ساتھ انہوں نے پہلے سے موجود واروں کا حوالہ بھی دیا۔ "اسادی وار" کے لئے گرنتھ صاحب میں ہدایت کی گئی ہے کہ اسے "ٹنڈے اسراج دی وار" کی طرز پر گایا جائے۔ گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وار کا اولین دور گورو صاحبان کے عہد سے پہلے کا دور ہے۔ جس میں وار اپنی ایک مخصوص اور منفرد شکل بنا چکی تھی۔[۳۹]

"ٹنڈے اسراج دی وار" سے لے کر "سید دی وار" تک پنجاب کو اس کے حقیقی روپ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ واریں صدیوں پرانے واقعات اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ آج بھی ہمیں کئی ایسی لوک واریں ملتی ہیں۔ جو

اپنی زبان اور ہنر کے اعتبار سے سیکڑوں برس پرانی ہیں۔ پھر بھی ان کی تازگی اور توانائی برقرار ہے۔ صرف ایک مثال سے ہی اس بات کو ثابت کیا جا سکتا ہے

خان سلطان' وڈ سورمے وچ رن دے گجے
خط لکھے ٹنڈے اسراج نوں پاتشاہی اجے
ٹکا سا رنگ باپ نے' دتا بھر لجے'

(ٹنڈے اسراج دی وار)

کئی ایسی واریں بھی ہیں جو ہیں تو کافی پرانی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کی زبان بدلتی چلی گئی ہے۔ کچھ نئی واریں بھی سننے میں آتی ہیں۔ لیکن ان کے موضوعات کافی پرانے ہوتے ہیں۔ "کیرو پانڈو دی وار" اگر آپ سنیں تو آپ کا دھیان یقیناً ہزاروں برس پیچھے چلا جائے گا۔ لیکن اس کی زبان کو دیکھ کر آپ کو صاف اندازہ ہو جائے گا کہ اس وار کی زبان سو پچاس برس سے زیادہ نہیں ہو سکتی[۴۰] فتح محمد ملک نے احمد سلیم کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک رزمیہ نظم' مزاحمت کے بیان یا جنگی تصادم کے شاعرانہ اظہار کے طور پر وار کی تعریف مختلف انداز میں ہوتی رہی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دونوں طرف کے پنجابی سکالروں نے وار کی اصل "ور" یا "ورت" بیان کی ہے۔ وہ اس سے اتفاق نہیں کرتے۔ ان کا خیال ہے کہ لفظ وار اوستا سے لیا گیا ہے جس کے معنی مزاحمت کرنا ہیں۔[۴۱] تاہم وہ تسلیم کرتے ہیں کہ صنف شاعری کے طور پر وار دور قدیم سے تعلق رکھتی ہے۔[۴۲] مثال کے طور پر وہ رگ وید کے گیت نقل کرتے ہیں۔[۴۳] یہ سلسلہ امیر خسرو سے ہوتا ہوا شاہ محمد اور عہد جدید کے شاعروں تک چلا آتا ہے۔

راجہ رسالو کی مہمات

واروں اور عوامی گیتوں کے قدیم ترین ہیرو راجہ رسالو کی داستان ہزار سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے بعد بھی دلچسپی اور شوق سے گائی جاتی ہے۔ راجہ رسالو سیالکوٹ کے راجہ سالباہن یا سالواہن کا بیٹا اور پورن بھگت کا

چھوٹا اور سوتیلا بھائی تھا۔ جو پورن کی دعا سے پیدا ہوا تھا۔ متعدد روایات کے مطابق رسالو نے رعایا پر اپنے باپ کے ظلم و ستم کا خاتمہ کرنے کے لئے اس کے خلاف جنگ کی۔ اس دوران وہ اسلام بھی قبول کر چکا تھا۔ اس نے طویل سفر کئے اور مختلف علاقوں سے راجاؤں' شہنشاہوں اور آفات کے ظلم و ستم سے غریب لوگوں کی جانیں بچائیں۔

راجہ رسالو کی داستانوں میں' بقول سرے برایا کوف' اپنے باپ کے خلاف جنگ کرنے' اس سے انتقام لینے کی خاطر اسلام قبول کرنے اور اپنے باپ کے خلاف جنگ گجرات کے راجہ سے مدد لینے کی تفصیلات ملتی ہیں۔ گجرات میں اس کی ملاقات ایک بوڑھے فقیر سے ہوتی ہے جو اسے مشورہ دیتا ہے کہ وہ غریبوں پر تلوار اور فقیروں پر اپنا ہاتھ نہ اٹھائے۔[۴۴] سرے برایا کوف کا حوالہ دیتے ہوئے فتح محمد ملک آر سی ٹمپل اور چارلس سونرٹن (Swynnerton Charles) سے مختلف اسناد پیش کرتے ہیں۔ سونرٹن کی جمع کردہ داستانوں میں راجہ رسالو کی اپنے باپ کے خلاف بغاوت کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

> "شہزادے نے اپنے باپ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے کہا: اگر آپ دو شرطیں مان لیں تو میں ہر معاملے میں آپ کی اطاعت کروں گا۔ پہلی شرط یہ کہ آپ مجھے مسلمان بنائیں اور دوسری یہ کہ آپ خود بھی مسلمان ہو جائیں۔"
>
> یہ لفظ سنتے ہی بادشاہ غصے سے آگ بگولا ہو گیا اور اپنے بیٹے کو فوراً محل سے نکل جانے کا حکم دیا۔

یہاں سے نکل کر رسالو مکہ چلا گیا اور سیالکوٹ فتح کرنے کے لئے مسلمان فوج ساتھ لے کر آیا۔ سیالکوٹ کی فتح کے بعد' مذہبی رہنماؤں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ محل کے اندر جائے اور اپنے باپ کو اسلام قبول کرنے کے لئے کہے۔ چنانچہ رسالو اندر گیا اور اپنے باپ سے کہا کہ یا وہ اسلام قبول کر لے یا پھر مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔[۴۵]

سالباہن کا بیٹا رسالو قسمت آزمائی کے لئے دنیا میں نکلا۔ وہ غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ مظلوموں کو ظالموں سے نجات دلاتا ہے۔ اس لئے بہت جلد عوامی ہیرو بن جاتا ہے۔ رسالو کے گیتوں میں بڑے بڑے ناممکن اور مافوق الفطرت واقعات بیان کئے گئے ہیں لیکن جن شہروں اور شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے' ان کی شہادت تاریخ سے بھی ملتی ہے' مثلاً گند گڑھ-- یہ ایک پہاڑی سلسلہ ہے۔ جو اٹک کے شمال میں دریائے سندھ کے قریب واقع ہے۔ ووہان کا

گاؤں--- یہ باغ نیلاب کے قریب دو مال کے گاؤں کا اولین نام ہے' اور سرکپ کا شہر جہاں رسالو نے ستر حسین و جمیل دوشیزاؤں کو اپنی بہادری سے مرعوب کیا۔ ٹیکسلا میں واقع ہے۔ پچھلے دنوں اس شہر کے کھنڈروں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تو اس مقام کے کھنڈر بھی ملے' جہاں رسالو نے راجہ سرکپ کے ساتھ چوپڑ کا کھیل کھیلا تھا۔ یہاں چوپڑ کے آٹھ خانے بھی بنے ہوئے ہیں۔

اس شہر کے بارے میں گیتوں کے کچھ بول یاد ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے راجہ سرکپ کی ایک رانی رسالو سے کہتی ہے۔

نیلے گھوڑے والیا' نیویں نیزے آ
اگے راجہ سرکپ ہے سردیسی اوہ لاہ
بھلا چاہیں اپنا تاں پچھے ہی مڑ جا

نیلے گھوڑے والے! اپنا نیزہ جھکا کر آ۔ آگے راجہ سرکپ بیٹھا ہے جو تمہاری گردن کاٹ لے گا۔ اگر بھلا چاہتا ہے تو پیچھے کی طرف مڑ جا۔

رسالو جواب دیتا ہے:

دوروں بیڑہ چکیا اتلھے فتح آئے
سرکپ دا سر کٹ کے ٹوٹے کرساں چار
تینوں بناساں وو ہٹڑہی میں بنساں مہراج

میں دور دراز سے آیا ہوں۔ میں نے جیت کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ میں راجہ سرکپ کا سر کاٹ کر اس کے چار ٹکڑے کر دوں گا۔ پھر تجھے دلہن بناؤں گا' اور خود مہاراج بنوں گا۔

لڑکی کو رسالو سے پیار ہو گیا' وہ راجہ سرکپ کے پاس جا کر کہنے لگی۔

اک جو آیا راجپوت کردا ماروں مار
تے نوں راجہ مارسی اتے سانوں کھڑسی نال

ایک راجپوت بڑے زور شور سے آ رہا ہے راجہ! وہ تمہیں ہلاک کر دے گا' اور مجھے ساتھ لے جائے گا۔

راجہ سرکپ کو اپنی طاقت پر ناز تھا' وہ بولا:

چھوٹی نگری دا واسکن رانی' وڈی کرے پکار
جد میں نکلاں باہر تاں میری بتاں نچاوے ڈھال
فجرے روٹی تاں کھاساں' سریساں اتار'

رانی! کیا کہتی ہو؟ ایک چھوٹی سی نگری باسی آیا ہے' اور تم اتنی چیخ پکار کر رہی ہو۔ میں ایک تو میری ڈھال ہی اسے نچائے گی۔ میں صبح سویرے اس کی گردن کاٹوں گا' اور پھر روٹی کھاؤں گا۔

راجہ سرکپ کا سر کاٹ کر رسالو نے کوکلاں کو ساتھ لیا اور مورتی کے پہاڑوں کی طرف چلا گیا' جو راولپنڈی کے جنوب مغرب میں واقع ہیں۔ راولپنڈی اور ٹیکسلا کے درمیان ایک مقام سنگ جانی آتا ہے جس کا دارالحکومت ہوڈی نگری اٹک کے نیچے دریائے سندھ پر واقع تھا۔ اسی سے راجہ ہوڈی کے باپ راجہ اٹکی مل کا سراغ ملتا ہے' جس کی سلطنت اٹک سے جلال آباد (افغانستان) تک پھیلی ہوئی تھی۔[۴۶]

بعض دیگر روایات کے مطابق اٹک کے راجہ ہوڈی نے جب راجہ رسالو کی رانی پر ڈورے ڈالنے شروع کئے تو اپنا تعارف یوں کرایا:

سندھ تو میری نگری رانی اٹک ہے میرا تھاؤں
راجہ اٹکی مل دا بیڑا راجہ ہوڈی میرا ناؤں

راجہ رسالو انہی پہاڑیوں میں شکار کھیل رہا تھا کہ اس کا طوطا جو پہیلیوں کی صورت میں اظہار کرتا تھا۔ راجہ رسالو سے ان الفاظ میں خبر رساں ہوا:

کیکر ہیٹھ ستیا راجہ منہ سے پلا لاہ ! !
رانی ہٹی کھولی آ کر کردی بنج بیوپار !
اک جو آیا راجپوت اس چک چک بدھے بھار[۴۷]

پنجابی صوفی شاعری--- بغاوت کے سرچشمے

پنجاب میں تصوف کی تاریخ شہنشاہیت کی نفی کرنے' بیرونی حملوں کے خلاف نفرت کا اظہار کرنے' قتل و خونریزی کو ناجائز قرار دینے' مذہبی منافرت سے بلند ہو کر سوچنے اور مظلوم طاقتوں کے حق میں آواز بلند کرنے کی تاریخ ہے۔ بابا فرید کے ساتھ ہی پنجابی شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ فرید بابا پہلے صوفی شاعر ہیں۔ جنہوں نے نہ صرف مروجہ سماجی قدروں سے بغاوت کی بلکہ اپنے رشتے عرب و فارس سے توڑ کر اس سرزمین سے استوار کئے۔ انہوں نے عربی اور فارسی کو ترک کر کے عوام کی زبان پنجابی کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ مسلمان حملہ آور ہندوستان میں تلوار لے کر وارد ہوا تھا۔ لیکن اس کی فوجوں کے ساتھ مسلمان صوفی بھی یہاں آئے۔ ان کے ہاتھ میں تلوار کی بجائے کتاب تھی۔ چنانچہ انہوں نے قتل و خونریزی کی مذمت کی اور صلح کل کا راستہ اختیار کیا۔ ان کے اس طریق کار کے نتیجہ میں بے شمار لوگ مسلمان ہوئے۔ بعد ازاں اسلامی تصوف پر جب ویدانت اور بھگتی لہر کے اثرات پڑنے شروع ہوئے تو صوفیوں نے مذہبی تبلیغ ترک کر دی اور یوں وہ مسجد اور ٹھاکردوارے سے بلند ہو کر انسانی وحدت کے گیت گانے لگے پنجابی میں ان خیالات کا اظہار مادھو لعل حسین اور بلھے شاہ کے یہاں بھرپور انداز میں ملتا ہے۔ فیضی اور داراشکوہ نے بھی ان خیالات کو پھیلانے کے لئے کافی کاوشیں کیں۔ جب صوفیوں کو ملحد قرار دے کر قتل کیا جانے لگا اور سرمد جیسے عظیم انسان دوست مجذوب کو اورنگ زیب عالمگیر کے حکم سے قتل کر دیا گیا تو صوفیوں کا حکمراں طبقوں سے سیدھا تصادم ہونے لگا۔ ان کی شہنشاہیت دشمنی کے بیسیوں واقعات لوگوں کی زبان پر ہیں۔ یہاں پنجاب کے مشہور صوفی حضرت میاں میر کا ایک واقعہ دہرانا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ایک بار شہنشاہ اورنگ زیب نے ایک شاہی دورے کے دوران حضرت میاں میر سے ملنا چاہا۔ جب وہ ان کے دروازے پر پہنچا تو دربان نے اسے اندر جانے سے روک دیا اورنگ زیب نے فارسی میں ایک مصرعہ لکھ کر اندر بھیجا۔

در درویش را دربان نیاید

یعنی درویش کے دروازے پر دربان نہیں ہونا چاہئے۔ میاں میر جی نے جوابی مصرعہ لکھ بھیجا۔

بیاید تا سگ دنیا نیاید

یعنی دربان ہونا چاہئے تاکہ دنیا کا کتا اندر نہ آ سکے۔ صرف یہی ایک واقعہ اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ پنجاب کے صوفیا شہنشاہیت کی دہشت سے قطعی خوفزدہ نہیں تھے۔[۴۸]

جدید مفہوم میں پنجابی شاعری کا باقاعدہ آغاز بابا فرید گنج شکر سے ہوتا ہے۔ جنہوں نے فارسی عربی کے ماحول میں آنکھ کھولنے کے باوجود عوام کی زبان' پنجابی زبان کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ احمد سلیم کے مطابق اندرونی شورشوں اور بیرونی حملوں کی چکی میں پسنے والے تیرھویں صدی عیسوی کے پنجاب کو بابا فرید کی شاعری میں تلاش کرنا بظاہر آسان نہیں ہے۔ لیکن ذرا غور کرنے پر ہم ان اجتماعی آنسوؤں کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے۔ جن پر موت کے خوف کی تہیں چڑھی ہوئی نظر آتی ہیں اور جن کے پس منظر میں ہمیں بھگتی لہر کی وہ مشترک قدریں دکھائی دیتی ہیں جو مسلمانوں کی ہند میں آمد کے بعد ہندو مسلم میل جول کا سبب بنیں۔[۴۹] اپنی بحث کو آگے بڑھاتے ہوئے احمد سلیم لکھتے ہیں کہ تیرہویں صدی کا پنجاب تقریباً ایک صدی تک منگول حملہ آوروں کے ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہا۔ اس عہد کے مورخوں نے پنجاب کی کہانی بڑے دردناک لفظوں میں بیان کی ہے۔ ان کی تحریروں سے اس عام خوف و ہراس کا پتہ چلتا ہے۔ جو بیرونی حملوں کے نتیجہ میں تمام پنجاب میں پایا جاتا تھا۔ علاوہ ازیں ہندو راجاؤں اور مسلمان بادشاہوں کے خلاف عام لوگوں کے دلوں میں جو گرہیں پڑ چکی تھیں وہ پھیل کر ایک اجتماعی صورت میں فرید بابا کی شاعری میں ملتی ہیں لیکن عوام کی یہ نفرت خوف کی گہرائیوں سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

فریدا دریا دے کنے بگلا بیٹھا کیل کرے
کیل کریندے ہنجھ نوں اچتے باز پئے
باز پئے تس رب دے کیلاں وسریاں
جو من چت نہ چیت سن سو گلیں رب کیاں

خوف و ہراس کی یہ لہریں بابا جی کے ان دوہوں میں اور بھی شدید ہو جاتی ہیں۔ جن میں وہ موت کا ذکر کرتے ہیں۔ ان دوہوں سے اس سماج کے طبقاتی تضاد کا بھی بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔[۵۰]

سکھ مذہب کے بانی اور پنجاب میں مسلمانوں کے بعد توحید کے ایک اور پرچارک گورو نانک نے بابا فرید کی روایت کو آگے بڑھایا۔ گورونانک کا دور لودھی راج کے آخری اور مغل شہنشاہیت کے ابتدائی دنوں پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ عہد بھی اپنی نوعیت کے اعتبار سے بڑا پرشور اور ہنگامہ پرور ہے۔ نانک نے اپنی شاعری میں الٰہی وحدت کے ذریعے انسانی وحدت کا پرچار کیا۔ "پنجابی لٹریچر" کے مصنف سرے بریاکوف کے لفظوں میں گرونانک کی تعلیمات ہندو مت' اسلام اور ہندوستان کے دیگر چھوٹے مذاہب کے درمیان دراصل ایک سمجھوتے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے دور میں پانچ بادشاہوں کے تخت الٹے گئے۔ گرونانک لٹتے اور کٹتے ہوئے پنجاب کو دیکھ رہے تھے۔ مغل شہنشاہ بابر نے حملہ کیا تو گورونانک نے لکھا۔

پاپ کی جنج لے کابلو دھایا
جودی منگے دان وے لالو
کھون کے سوہلے گاویا نانک
رت کا کنگو پائے وے لالو[۵۱]

بابا فرید اور گورو نانک کے بعد پنجابی تصوف اور پنجابی بغاوت کی مسلمان روایت کا پرچم شاہ حسین نے بلند کیا۔ آج بھی لاہور میں ان کے مزار پر مشہور میلہ چراغاں لگتا ہے۔ حسین نے خود کو ملامتی قرار دیا تھا۔ یہ ان کی بغاوت کا ایک اپنا انداز تھا۔ بقول احمد سلیم مادھو لعل حسین کا دور مغل شہنشاہیت کا سنہری دور کہا جاتا ہے۔ اکبر بادشاہ کا دین الٰہی بظاہر وسیع المشرب انسان دوستی کے جذبے کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ مسلمان بادشاہوں نے ہندو رانیوں کو اپنے حرم میں سجا کر ایک متحدہ قومی ہندوستان کی داغ بیل ڈالنے کی کوشش کی بادشاہ کے نورتنوں نے ادب' تاریخ اور فلسفے میں عظیم علمی کارنامے سرانجام دیئے۔ لیکن اس تمام کارروائی کا بغور جائزہ لیا جائے تو پتہ چلے گا کہ ہندوستان کے اتحاد کا سارا ڈھونگ بالائی سطح پر رچایا گیا۔ اونچے طبقات جو پہلے ہی سے متحد تھے۔ اب سرکاری پالیسی کے طور پر ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ گئے۔ بادشاہ اور اس کے اہل کار کسانوں کی اس تحریک کو پھلتے پھولتے دیکھ رہے تھے۔ جس کی بنیاد گرونانک رکھ چکے تھے۔ بادشاہ اس تحریک کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے اس نے اونچے

طبقات کے اتحاد کو بنیادی اہمیت دی۔ لیکن کسان تحریک کسی ایک شخص کی خواہش پر شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ ہی کسی ایک آدمی کی خواہش پر ختم ہو سکتی تھی۔[۵۲]

ہمارے عہد کے سب سے معتبر پنجابی شاعر نجم حسین سید نے شاہ حسین اور مغل عہد کے پنجابی انقلابی دلا بھٹی کے تعلق کو نہایت خوبصورتی سے اجاگر کیا ہے۔ اس تعلق کی داخلی جدلیت کو نمایاں کرتے ہوئے احمد سلیم لکھتے ہیں:

"چنانچہ مادھو لعل حسین کا تصوف بادشاہ اور اس کے کاسہ لیس سازشی درباریوں کے خلاف جدوجہد کا اعلان نامہ ہے جس پر اس عہد کے کسانوں نے اپنے لہو سے دستخط ثبت کئے۔ مقامی روایات کے مطابق پنجاب میں "بار" کے علاقے میں ایک کسان فرید نے گورو نانک کے لفظوں میں "جوری" یعنی زبردستی دان سے انکار کر دیا۔ زمین کا مالیہ دینے کا انکار اس کے قتل کا حکم بن گیا۔ اس کی چمڑی میں بھوسہ بھر کر اسے برسرعام لٹکا دیا گیا تاکہ لوگ آئندہ بغاوت کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ لیکن یہ آگ اور بھڑک اٹھی۔ فرید کے بیٹے دلے نے بار کے علاقے میں مغل راج کے خلاف تحریک چلائی اور بادشاہ کے گماشتوں کو مالیہ دینے سے انکار کر دیا۔ اس کی سرگرمیوں کو نظر میں رکھنے اور اسے گھیر کر ختم کرنے کے لئے اکبر بادشاہ نے شیخوپورہ کے نزدیک ایک آلبرزویٹری بنوائی اور اسے ہرن مینار کے نام سے مشہور کیا۔ دلا بھٹی عوام کا اتنا محبوب کردار بن گیا کہ حقائق مختلف روایات سے گزرتے ہوئے مختلف شکلیں بدلتے گئے۔ لیکن یہ بات بہرحال افسانہ نہیں ہے کہ شاعر مادھو لال حسین کا انقلابی دلا بھٹی سے تعلق تھا۔ "حقیقت الفقراء" نامی فارسی مثنوی میں بتایا گیا ہے کہ جب دلے کو لاہور کی گھوڑے منڈی میں پھانسی دی جا رہی تھی۔ اس وقت مادھو لعل حسین وہاں موجود تھا۔ اس کتاب سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ حسین کی پراسرار سرگرمیوں کے باعث مقامی پولیس اس کے پیچھے لگی رہی تھی۔ ان حقائق کی تصدیق مقامی روایات سے بھی ہو جاتی ہے اور یوں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ شاعر حسین انقلابی دلا بھٹی کی زبان تھا۔

اس نظر سے شاہ حسین کی شاعری کو دیکھا جائے تو اس کی رندی اور مستی سمجھ میں آ جاتی ہے وہ اپنے آپ کو ملامتیہ فرقے کا ایک فرد شمار کرتا ہے۔ شرعی احکامات کا باغی ہے۔ ایک خوبصورت ہندو لڑکے مادھو کو ساتھ لئے شہر میں مست الست گھومتا ہے۔[۵۳]

ہمارے عہد میں ہی وہ تمام واریں دریافت کی گئی ہیں جو دلا بھٹی کی مزاحمت کی تاریخی دستاویز ہیں۔

اٹھارہویں صدی میں بلھے شاہ اور وارث شاہ نے اس بغاوت کے سلسلے کو جاری رکھا۔ اس وقت درانی حملوں کا زور ٹوٹ رہا تھا اور پنجاب زخموں سے چور اور لہولہان تھا۔ بلھے کے ہونٹوں پر بین تھے۔

منہ بارھویں صدی پسار یا

سانوں آ مل یار پیار یا

لیکن اٹھارویں صدی کے زخمی اور لہولہان پنجاب میں یار کہاں سے ملتا۔ وہ تو حملہ آوروں کے قافلے کے ساتھ زنجیروں میں جکڑا ایران اور افغانستان کے بازاروں میں بکنے جا رہا تھا۔ اس کی چنری تار تار تھی اور زلفیں اونٹوں کے کجاووں کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں۔ بلھے شاہ کے بعد علی حیدر، ہاشم شاہ اور فرد فقیر نے صوفیانہ خیالات کا پرچار کیا لیکن یہ تمام شاعر کوئی ایسا بھرپور تاثر نہ دے سکے جو پنجابی کے صوفی شاعروں کی نمایاں روایت تھی۔ علی حیدر اگرچہ لفظوں کا بازی گر ہے لیکن اس کے شعور کی آنکھیں کھلی ہیں اور وہ اپنے ماحول کی طرف سے آنکھیں بند کر کے نہیں بیٹھا ہے۔ وہ جس دور میں سانس لے رہا ہے۔ اس کی گھٹن کا شکار نہیں ہوا بلکہ بڑی جرات اور حوصلہ مندی کے ساتھ بیرونی حملہ آوروں کی لوٹ کھسوٹ اور مقامی حاکموں کی بزدلی اور بے شرمی کا ذکر کرتا ہے۔

ایہہ ایرانی نادر ظلم، ظلم کنوں مول نہ منگدے نی

میڈے دل دی دلی لٹی، حیدر ہور کیہ ساتھوں منگدے نی

ب بھی زہر جوکھا صرف کجھ شرم نہ ہندوستانیاں نوں

کیہا حیا ایتھاں راجیا نوں، کجھ لج نہیں تو رانیاں نوں

بھیڑے بھر، بھر دین خزانے، فارسیاں نوں خراسانیاں نوں

انگریزی عہد کے خواجہ فرید پنجابی صوفی شاعروں کی روایت کے آخری بڑے شاعر ہیں۔ خواجہ فرید کی شاعری بنیادی طور پر فراق کی شاعری ہے۔ لیکن ان کے افکار کا منبع ابن العربی ہیں۔

ہے یار دا جلوہ لہر لہر جا

سبحان اللہ سبحان اللہ

مگر وہ پنجابی شاعری کی جرات مند روایت سے الگ نہیں رہ سکے۔ بہاولپور کے نواب کو ایک جگہ تلقین کرتے ہیں

اپنے ملک کوں آپ وساتوں

پٹ انگریزی تھانے

اس تاریخی پس منظر کی روشنی میں، اب ہم انگریزوں کے خلاف پنجاب کی جنگ آزادی کا باقاعدہ مطالعہ پیش کریں گے۔

حوالے

1- Serebrayakov, Punjabi Literature, Moscow, 1968, p.10.

۲۔ احمد غزالی، ساندل بار، فیروز سنز، لاہور، ت۔ن، صفحہ ۴۷

۳۔ میاں اللہ دتہ سلیم سیمی، تاریخ دیپالپور، لاہور، ۱۹۹۳ء، صفحہ ۲۰

۴۔ قریشی احمد حسین قلعداری، گجرات بعہد قدیم و جدید، گجرات، ۱۹۶۸ء، صفحات ۲۲۔۲۳ بحوالہ منشی گنیش داس چہار باغ پنجاب

۵۔ ایضاً، صفحات ۲۶۔۲۷

۶۔ اسد سلیم شیخ، دلے دی بار (پنڈی بھٹیاں اور گرد و نواح کی تاریخ)، لاہور، ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۴

۷۔ احمد سلیم، پنجابی ادب ایک سوالیہ نشان، کراچی، ۱۹۸۶ء، صفحہ ۹

۸۔ سمیع اللہ قریشی، سرزمین جھنگ۔ آثار و ثقافت، لاہور، ۱۹۹۸ء، صفحات ۶۶۔۶۷

۹۔ ایضاً، صفحہ ۶۷

۱۰۔ ایضاً، صفحات ۶۸۔۶۹

۱۱۔ ایضاً، صفحہ ۶۹

۱۲۔ احمد سلیم، پنجابی ادب.....، صفحات ۹۔ ۱۰

۱۳۔ احمد سلیم، پنجاب (پنجابی)، رچناب پبلشرز گوجرانوالہ، ۱۹۷۰ء، صفحات ۱۳۔۱۴

۱۴۔ عزیز ملک، پوٹھوہار، لوک ورثہ اسلام آباد، ۱۹۸۷ء، صفحات ۳۶۔ ۳۷

۱۵۔ محمد فاضل، پوٹھوہار ماضی۔ حال کے آئینے میں در رشید نثار، وادی پوٹھوہار، راولپنڈی، ۱۹۹۵ء، صفحہ ۴۱

۱۶۔ عزیز ملک، پوٹھوہار، صفحہ ۳۷

۱۷۔ ایضاً، صفحات ۳۷۔ ۳۸

۱۸۔ ایضاً، صفحات ۳۸۔ ۳۹

۱۹۔ ایضاً، صفحات ۴۰۔۴۱

۲۰۔ عمر ڈھاڈی، مشین محلّہ، جہلم شہر

۲۱۔ ایضاً۔

۲۲۔ حیات ڈھاڈی، محلّہ مسجد عالم شاہ، پنڈ دادنخاں

۲۳۔ اسد سلیم شیخ، دلے دی بار، لاہور، ۱۹۹۷ء، صفحہ ۱۶

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ سمیع اللہ قریشی، سرزمین جھنگ، صفحات ۷۶۔۷۷

۲۶۔ منشی عبدالرحمان خان، تاریخ ملتان ذیشان، ملتان، ۱۹۸۵ء، صفحہ ۱۲۳

۲۷۔ مقبول حسین بھٹی، ''آئینہ جہلم''، جہلم، ت۔ ن، صفحہ ۳۲

quoted in Fateh Mohammad Malik, Punjabi Identity, p.41.

۴۵۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، پوٹھوہار کے عوامی گیتوں میں تاریخی واقعات در رشید نثار (مرتب)، وادی پوٹھوہار، صفحات ۹۳۔۹۵

۴۶۔ سید علی نواز گردیزی، پوٹھوہار دلفریب داستانوں کا خطہ در رشید نثار (مرتب)، وادی پوٹھوہار.... صفحہ ۱۰۰

۴۷۔ احمد سلیم، پنجابی ادب..... صفحات ۱۱۔۱۲

۴۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۲

۴۹۔ ایضاً، صفحات ۱۲۔۱۳

۵۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۳

۵۱۔ ایضاً

۵۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۴

۵۳۔ ایضاً، صفحات ۱۴۔ ۱۵

دوسرا باب

غلامی کا آغاز اور اس کے خلاف مزاحمت

۱۸۳۹ـ۱۸۴۹ء

رنجیت سنگھ کی موت (۱۸۳۹ء) اور اس کے بعد سکھ دربار کی طوائف الملوکی نے پنجابی ریاست کی آزادی اور خود مختاری کا خاتمہ کر دیا۔ پنجاب کا نیا مہاراجہ دلیپ سنگھ ایک نابالغ بچہ تھا جس کی نگران اس کی ماں رانی جند کور یا جنداں اس طوائف الملوکی کا ایک مرکزی کردار تھی۔ اس مہاراجہ نے انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں جلاوطنی کی حالت میں پیرس میں انگریزوں سے پنجاب دوبارہ جیتنے کے لئے جنگ آزادی کا اعلان کرنا اور اسی حالت میں جلاوطنی کی موت مرنا تھا۔

جنگ ہند پنجاب

اس سے بہت پہلے، پہلی اینگلو۔ سکھ جنگ (۴۶ـ۱۹۴۵ء) میں پنجاب کی آزادی کے خاتمے کا باقاعدہ آغاز ہو چکا تھا۔ واقعات کے مطابق پہلی پنجابی جنگ ایک ایسی سازش کا نتیجہ تھی جس میں پنجابی حکومت کے سربراہ کے علاوہ اس کی فوج کا کمانڈر انچیف تیج سنگھ بھی شریک تھا۔ پنجاب دربار کے لئے پنجابی فوج الہ دین کی بوتل سے نکلا ہوا ایسا جن بن چکی تھی جسے واپس بوتل میں بند کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی فوج بن چکی تھی جس کی خوشنودی اور خفگی دونوں صورتوں میں بربادی کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا۔ رانی جنداں کا خیال تھا کہ نافرمان اور باغی فوج کو انگریزوں کے ساتھ لڑا کے کمزور کیا جائے اور پھر اسے کنٹرول کیا جائے۔ یہ مقصد حاصل کرنے کے لئے پہلے یہ

پروپیگنڈہ کیا گیا کہ انگریز پنجاب پر حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ویسے بھی انگریز بہت پہلے سے ان تیاریوں میں مصروف تھے۔ چنانچہ جنداں کے لئے یہ ثابت کرنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ پنجابی فوج بھی ایک عرصے سے اپنے اڑوس پڑوس سے الجھنے کے لئے کسمسا رہی تھی کیونکہ اندرون ملک اس کی مسلسل لوٹ مار کے نتیجے میں اب لوٹنے کے لئے کوئی چیز باقی نہیں بچی تھی۔ چنانچہ فوج جلد ہی انگریزوں سے ٹکر لینے کے لئے بیتاب ہو گئی۔ ایک عام فوجی کو انگریزوں کی فوجی طاقت کا اندازہ نہیں تھا لیکن پنجاب کی فوج کے پنچ حقیقت سے واقف تھے۔ انہوں نے ابتد امیں انگریزوں سے ٹکر لینے کی مخالفت کی۔ مگر رانی جنداں نے پروپیگنڈے کا وہی حربہ استعمال کیا جو پہلے پنچ استعمال کیا کرتے تھے۔ اس نے سرگوشیوں کی مہم چلائی کہ اس جنگ کی مخالفت وہ لوگ کر رہے ہیں جو انگریزوں کے ایجنٹ اور غدار ہیں' اس طرح جنداں نے فوجی پنچوں کو انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے پر مجبور کر دیا۔

جنگ کا اعلان رنجیت سنگھ کی سمادھی پر کیا گیا۔ وہاں فوج کی تمام پنچ کمیٹیوں نے اکٹھے ہو کر عہد کیا کہ وہ انگریزوں کو نیست و نابود کر کے دم لیں گے۔ ۱۱ دسمبر ۱۸۴۵ء کو پنجاب کی فوج دریائے ستلج کے دوسرے کنارے واقع بین الاقوامی سرحد سے گزر کر انگریز علاقے میں داخل ہو گئی۔ اس جنگ کے لئے نہ تو عوام میں سیاسی پروپیگنڈہ کیا گیا تھا اور نہ ہی انتظامی تیاری کی گئی تھی۔[1]

اس جنگ کی متعدد جھڑپوں میں' پہلی اہم جھڑپ مدکی کے مقام پر ۱۶ دسمبر ۱۸۴۵ء کو ہوئی۔ پنجابی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی اور اس کی کمان وزیر لال سنگھ کر رہا تھا جو خود پنجاب کو شکست دلوانے کی سازش میں شامل تھا۔ چنانچہ پنجابی فوج کے ساتھ اس کی کمان کرنے والوں نے دھوکہ کیا۔ دریائے ستلج کو عبور کرنے کے بعد لال سنگھ نے انگریزی فوج کے کیپٹن نکلسن کو چٹھی لکھی کہ وہ پنجابی فوج کو دو دن تک پیش قدمی سے روکے رکھے گا تاکہ اس کا ملاپ پیدل فوج سے نہ ہو سکے بشرطیکہ اسے اور رانی جنداں کو حکومت برطانیہ کا دوست سمجھا جائے۔

کمان کرنے والے جرنیل کی دغا بازی کے باوجود پنجابی فوج کا عام سپاہی اتنی بہادری سے حملہ آور ہوا کہ برطانوی فوج میں افراتفری پیدا ہو گئی۔ پنجابی توپچیوں کی گولہ باری سے یورپین رجمنٹ کے پاؤں اکھڑ گئے۔ لیکن فتح انگریزوں کی ہوئی۔ کیونکہ پنجابی فوج کا کمانڈر لڑائی شروع ہوتے ہی فوج کو چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ اس لڑائی میں دو برطانوی

جرنیل مارے گئے۔ ایک میجر جنرل سر رابرٹ بیل اور دوسرا میجر جنرل سر جان مکاسکی۔

اسی طرح ۱۰ فروری ۱۸۴۶ء میں سبھراؤں کی جھڑپ میں پنجابی فوج کی کمان کمانڈر انچیف جنرل تیج سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ اس نے بھی اپنی فوج کے ساتھ وہی کیا جو اس سے پہلے لال سنگھ کر چکا تھا۔ پہلا حملہ ہوتے ہی تیج سنگھ بہادری سے جنگ میں مصروف فوج کو چھوڑ کر ستلج کو عبور کر کے اپنے علاقے میں جا چھپا۔ اس نے جاتے جاتے ستلج پر کشتیوں کا بنا ہوا پل توڑ دیا تاکہ پنجابی فوج کی مدد کے لئے کمک نہ پہنچ سکے اور پیچھے ہٹنے کی راہ بھی نہ ملے۔ کمانڈر انچیف کی غداری کے باوجود فوج بڑی بے جگری سے لڑی۔ اس جنگ میں میجر جنرل سر رابرٹ ڈک جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہ جرنیل واٹرلو کے محاذ پر نپولین کے خلاف جنگ لڑ چکا تھا۔ اور جانا پہچانا جرنیل تھا۔ اس لڑائی پر تبصرہ کرتے ہوئے کننگھم لکھتا ہے۔ "لاہور دربار کی عظمت کی حفاظت کے لئے فوج کے سپاہیوں اور نچلے درجے کے افسروں نے بہت اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ لیکن فوج و سول کے اعلیٰ افسروں نے ان کی کوششیں ناکام بنا دیں۔"

پہلی سکھ جنگ نے پنجاب کی فوج کی کمر توڑ کر رکھ دی اور اس کی تنظیم کو سخت نقصان پہنچا۔ اس جنگ میں آٹھ ہزار سپاہی مارے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہوئے۔ سارے توپخانے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

۱۲ فروری ۱۸۴۶ء کو انگریز فوج ستلج سے گزر کر اس پنجاب میں داخل ہو گئی جس کی آزادی کا سودا طے کیا جا رہا تھا۔ انگریزوں نے قصور پر قبضہ کر لیا۔ لاہور دربار کی جانب سے گلاب سنگھ ڈوگرا انگریزوں کے ساتھ صلح کی شرائط طے کرنے کے لئے آیا۔ اس جگہ سے ۱۸ فروری ۱۸۴۶ء کو انگریز گورنر جنرل نے مہاراجہ دلیپ سنگھ کو للیانی طلب کر کے اطاعت گزاری کا اعلان کرایا۔ ۲۰ فروری ۱۸۴۶ء کو انگریز گورنر جنرل نے کمانڈر انچیف سمیت میاں میر لاہور چھاؤنی میں ڈیرے ڈال دیئے۔ ۸ مارچ ۱۸۴۶ء کو لاہور دربار اور انگریزوں کے درمیان مندرجہ ذیل معاہدہ طے پایا۔[۲]

۱۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مہاراجہ دلیپ سنگھ کو پنجاب کا خود مختار حکمران تسلیم کرتی ہے۔ کیونکہ راجہ کم سن ہے اس لئے اس کی والدہ ایجنٹ ہو گی اور لال سنگھ وزیر ہو گا۔

۲۔ لاہور دربار مسلح افواج کی تعداد کم کرے گا۔ پیدل فوج بیس ہزار اور گھوڑ سوار بارہ ہزار سے زیادہ نہیں ہوں گے۔

۳۔ وہ تمام توپیں جو انگریزوں کے خلاف استعمال کی گئی تھیں کمپنی کی تحویل میں دے دی جائیں گی۔

۴۔ اگر برطانوی فوج کو لاہور سے گزرنے کی ضرورت ہو گی تو لاہور دربار انگریز افواج کو سہولتیں فراہم کرے گا۔

۵۔ لاہور دربار کسی بھی یورپی یا امریکی باشندے کو کمپنی کی اجازت کے بغیر ملازم رکھ نہیں سکے گا۔

۶۔ انگریز فوج کا ایک دستہ امن و امان قائم کرنے میں مدد دینے کے لئے سال کے آخر تک لاہور میں مقیم رہے گا اور اس کے اخراجات لاہور دربار ادا کرے گا۔

۷۔ لاہور دربار میں انگریز ریذیڈنٹ افسر قیام کرے گا۔

۸۔ لاہور دربار ڈیڑھ کروڑ روپے تاوان جنگ ادا کرے گا۔[۳]

اس ذلت میں مزید اضافہ اس وقت ہوا جب پنجاب دربار میں کونسل کی سربراہ اعلیٰ اور قانونی طور پر دلیپ سنگھ کے سن بلوغت کو پہنچنے تک پنجاب کی سربراہ رانی جنداں کے بغیر پنجاب کے باون سرداروں نے انگریزوں سے ایک اور معاہدہ کر لیا جس کی ایک شق کے مطابق رانی جنداں کو کونسل کی سربراہی سے علیحدہ کر کے اس کی جگہ انگریز ریذیڈنٹ مقرر کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ گویا اب خود رانی جنداں انگریزوں کی نظروں میں کھٹکنے لگی تھی۔ چنانچہ ۱۶ دسمبر ۱۸۴۶ء کے اس معاہدے کی مدد سے انہوں نے رانی جنداں کی اس قدر تذلیل کی کہ پنجاب میں اس کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا ہو گئے۔ جلد ہی اسے دلیپ سنگھ سے جدا کر کے شیخوپورہ کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ اس کے وزیر لال سنگھ کو وزارت سے ہٹا کر بنارس جلاوطن کر دیا گیا۔ یہ معاہدہ پنجاب کی غلامی کا پروانہ بن گیا۔

شاہ محمد

شاہ محمد (۱۷۸۰-۱۸۶۲) کی وار مدکی کے مقام پر لڑی جانے والی اسی جنگ کا شاعرانہ محاکمہ اور پنجاب کی غلامی کی ابتدا کا دردناک نوحہ ہے جس میں پنجابی فوج کے سپہ سالاروں کی غداری اور عام پنجابی سپاہی کی بے مثال شجاعت کا بیان شاہ محمد کے سیاسی شعور اور اس کی اپنی حب الوطنی پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اسے صاحب سیف و

قلم بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ اس جنگ میں اس نے خود بھی عملی طور پر حصہ لیا تھا۔[۴]

شاہ محمد نے اپنی وار اس وقت لکھی جب پنجاب پر انگریزوں کا قبضہ مکمل ہو چکا تھا۔ ہر طرف پھانسیاں گڑی ہوئی تھیں۔ اس نے لوگوں کی زخمی روح کے بین ہی نہیں ڈالے بلکہ انگریزوں کے خلاف ان کی نفرت کو زبان بھی دی۔[۵]

پنجاب پر انگریزی قبضے کو شاہ محمد "آفات" ہی قرار نہیں دیتا بلکہ پنجاب پر ایک تیسری ذات (قوت) کے تسلط کے دکھ کا اظہار بھی کرتا ہے:

راضی بہت رہندے مسلمان ہندو، سراں دوہاں دے اتے آفات آئی
شاہ محمدا! وچ پنجاب دے جی، کدے نہیں سی تیسری ذات آئی۔[۶]

مدکی کی جنگ میں شکست کے بعد پنجاب میں جس "برچھا گردی" کا دور دورہ ہو گیا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے شاہ محمد لکھتا ہے:

کیہا برچھیاں انہہ ہٹیر پایا، جیہڑا بہے گدی اوہنوں مار لیندے
کڑے کیہے انعام روپئے باراں، کدی پنج نہ ست نہ چار لیندے
کئی ترے نی قلعے دی لٹ کر کے، کئی شہر تے لٹ بازار لیندے
شاہ محمدا! چڑھے مجھیل بھیئے، پیسہ طلب دا نال پیندار لیندے[۷]

اسی برچھا گردی کے حوالے سے رانی جنداں کے دل میں بیٹھ کر شاہ محمد یوں اظہار کرتا ہے۔

مینوں آن چو فیر یوں گھوردے نیں، لیندے مفت انعام روپئے باراں
جٹی ہوواں تے کراں پنجاب رنڈی، سارے دیس دے وچ چا ٹرن واراں
چھڈاں نہیں لاہور وچ وڑن جوگے، سنے وڈیاں افسراں جمعداراں
پئے رلن گے وچ پردیس مردے، شاہ محمدا! مار نی ایس ماراں[۸]

یہی نہیں، وہ رانی جنداں پر سازش اور فوج میں نفاق پیدا کرنے کا الزام عائد کرتا ہے۔ رانی انگریزوں کو لکھتی ہے:

پہلاں پار دا ملک توں مل ساڈا' آپے غصہ تیں تھیں آونے گے
سوئی لڑن گے' ہون بے خبر جیہڑے' متھا کدے سردار نہ ڈاہونے گے
ایسے واسطے فوج میں پاڑ چھڈی' کئی بھانج اچانکی پاونے گے
شاہ محمدا! لاٹ جی کٹک تیرے' میرے گلوں تگاوڑا لاہونے گے[9]

ہم ان واقعات کی تفصیل پہلے ہی بیان کر چکے ہیں کہ کیسے کمانڈر انچیف تیج سنگھ' وزیراعظم لال سنگھ کی فوجیں لڑائی سے پہلوتہی کر گئی تھیں۔ ان غدار سرداروں نے مدکی' پھیرو شہر' سبھراؤں جیسے معرکوں میں اسی طرح ہاتھ دکھائے تھے۔ ان کی انہی کارستانیوں کے سبب انگریزوں کی کامیابی پر آنسو بہاتا ہے:

شاہ محمدا! گوریاں چھیڑ چھیڑی' ملک پار دا ملیا آن میاں[10]

لیکن لوگ انگریزی قبضے کو اتنی آسانی سے قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ عام پنجابی سپاہی ایک کے بعد دوسرا معرکہ گرم کرنے کے لئے بے چین تھے۔ ان پسپائیوں کے بعد وہ فیروز پور جا پہنچے۔ اس بار ان کی مزاحمت کا رنگ ایسا تھا کہ پورے ہندوستان میں بھگدڑ مچ گئی:

لگی دھمک سارے ہندوستان اندر' دلی' آگرہ' ہانسی' حصار میاں
بیکانیر' لکھنؤ' اجمیر' جے پور' پیاں بھاجڑاں جمنا توں پار میاں
چلی سبھ پنجاب دی بادشاہی' نہیں دلاں دا انت شمار میاں
شاہ محمدا! کسے نہ اڑکنا اے' سنگھ رہن گے دلی نوں مار میاں

اودھر آپ فرنگی نوں بھانج پئی' دوڑے جان گورے' دتی کنڈ میاں
چلے توپخانے سارے گوریاں دے' مگر ہوئی بندوق دی پھنڈ میاں
کیہے جا کے لیا کے خبر دتی' لندن ہو بیٹھی تیری رنڈ میاں
شاہ محمدا! ویکھ میدان جا کے' رلدی گوریاں دی پئی جھنڈ میاں[11]

اس مرحلے پر فرید کوٹ کا راجہ پھاڑا سنگھ انگریزوں کی مدد کو آتا ہے۔ وہ انہیں اندر کی خبریں دیتا ہے اور یوں گورے ہاری ہوئی بازی دوبارہ جیت لیتے ہیں:

مٹھی میٹی سی ایس پنجاب دی جی' ایہناں کھول دتا اج پاج یارو!

سکھ سرداروں نے جس طرح غداری کر کے پنجاب پر انگریزی قبضے کے لئے راہ ہموار کی' اس پر شاہ محمد دھیمے مگر طنزیہ لہجے میں یوں اظہار کرتا ہے:

گھروں گئے فرنگی دے مارنے نوں' بیڑے توپاں دے سبھ کھوہا آئے
فیر آفتاں نوں مگر لائیو نیں' سگوں اپنا آپ گوا آئے
خوشی وسدا شہر لہور سارا' سگوں کنجیاں ہتھ پھڑا آئے
شاہ محمدا! کہندے نیں لوک سنگھ جی' سیں چنگیاں پوریاں پا آئے[۲]

شاہ محمد بنیادی طور پر ایک پنجابی قوم پرست شاعر ہے۔ اس کا "جنگ نامہ سکھاں تے فرنگیاں دا" یا "جنگ ہند پنجاب" صرف ادبی ہی نہیں بلکہ ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے۔ اس کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ شاعر خود تمام واقعات کا چشم دید گواہ ہے۔ مزید براں' یہ پنجابی عوام کی نو آبادیاتی حکمرانوں کے خلاف جدوجہد کا پہلا بیانیہ ہے جس میں شاعر نے پنجاب کی قومی تاریخ کے اہم واقعات کو اتنی تفصیل اور باریک بینی سے بیان کیا ہے کہ اسے پہلی اینگلو۔ سکھ جنگ کا ایک مستند تاریخی ریکارڈ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس نے سکھوں کی شکست کے اسباب کو قدرے تلخی کے ساتھ لیکن انتہائی معروضی انداز میں بیان کیا ہے۔ وہ سکھ سرداروں کی غداری پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کرتا۔

نظم کا آغاز جنگ سے پہلے کے واقعات--- سرداروں کا باہمی نفاق اور اس نفاق کی خلیج کو پاٹنے میں سکھ کونسل کی کوششیں وغیرہ--- سے ہوتا ہے۔ پھر شاعر جنگ کے واقعات کو ترتیب وار بیان کرتا ہے۔ اس کے بیان سے اس بات کی نشاندہی بھی ہوتی ہے کہ وہ خود بھی غیر ملکی حکمرانوں کے خلاف اس جنگ میں شریک تھا۔[۳] شاعر عملاً" بھی اور نظریاتی سطح پر بھی اپنے عوام کے ساتھ کھڑا ہے۔ وہ خود کو فخریہ ایک پنجابی کہتا اور پنجابی عوام کی ایکتا پر زور دیتا

ہے۔ وہ پنجاب میں تیسری ذات (انگریز قوم) کی آمد کو پنجاب کے لئے ایک آفت قرار دیتا ہے۔

اس کی نظر پنجابی عوام کا استحصال کرنے والے ساہوکاروں پر بھی ہے جن کے بارے میں وہ کہتا ہے:

شاہ محمدا! دولتاں جمع کردا' شاہوکاراں دا پت گماشتہ ای

دیگر شہادتیں

شاہ محمد کے علاوہ دیگر شاعروں نے بھی اینگلو۔ سکھ جنگوں اور پنجاب پر انگریزی قبضے کے حوالے سے طویل نظمیں لکھی ہیں۔ "جنگ نامہ لہور" بھائی کاہن سنگھ بنگہ کی تصنیف ہے۔ یہ نظم تاریخی حقائق اور شاعرانہ عظمت سے بہت دور ہے اور انگریزوں کی خوشامد کے ذریعے امن کے زمانے کی نوید دی گئی ہے۔[۱۴]

ایک اور پنجابی شاعر مٹک نے بھی شاہ محمد کی طرح اس جنگ کا احوال لکھا ہے۔ مٹک کی اس جنگ نامے میں اگرچہ شاہ محمد جیسی غنائیت اور طاقتور اظہار نہیں ملتا پھر بھی وہ اپنے قصے کے آغاز میں ہی انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کی پالیسی کو نشانہ بناتا ہے:

پار ہوئے سبھ اکٹھے' پہنچے دھر سرکارے' آن پکارے
پیسہ ساتھوں منگے فرنگی' اسیں غریب وچارے' کھیتیاں وارے

شاہ محمد کی طرح مٹک بھی سکھ سرداروں کی غداری کو اپنا موضوع بناتا اور خصوصیت کے ساتھ تیجا سنگھ اور لال سنگھ کا ذکر کرتا ہے:

تیجا سنگھ اور لال سنگھ' ہین مصاحب پرانے' کروے بھانے
باہروں گلاں کرن مٹھیاں' اندروں کھوٹ کمانے' کروے بھانے[۱۵]

شاہ محمد کی طرح مٹک بھی جنگ کی ذمہ داری رانی جنداں اور فوجی جرنیلوں پر ڈالتا ہے لیکن بنیادی ذمہ داری وہ انگریزوں پر ڈالتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ مدکی کی جنگ اس لئے ہوئی کہ انگریزوں نے ستلج پار پنجاب دربار کی رعایا کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ جس پر عام لوگوں نے دربار میں آکر دہائی دی۔ مٹک کے لفظ ہیں:

پار سبھ ہوئے اکٹھے، دھر سرکارے، آن پکارے
پیسہ ساتھوں منگے فرنگی، اسیں غریب وچارے، کھیتیاں وارے
جے زور ہے وچ تہاڈے، ڈھل نہ کرو پیارے، لشکر بھارے
کہت مٹک، جب سنی پنتھ نے، غصہ چڑھیا سارے، بھئے تیارے[۱۶]

شاعر مٹک کے بارے میں یہ پتہ نہیں چل سکا کہ وہ کون تھا، کہاں کا رہنے والا تھا اور اس وار کے علاوہ اس نے اور کیا کچھ لکھا۔

لاہور کی خانہ جنگی (۴۳-۱۸۳۹ء) کے حوالے سے ڈھولے کی طرز پر ایک لوک وار ملتی ہے جو شاہ محمد کے ایک مصرعے۔

چیت سنگھ نوں ماریا کنور صاحب، شروع ہوئی دربار تلوار میاں

کو بنیاد بنا کر لکھی گئی ہے۔ اسے ڈھاڈی لوگ گاتے ہیں۔ اس کا آغاز ۸ اکتوبر ۱۸۳۹ء کے روز دربار میں چیت سنگھ کے قتل کے واقعہ سے ہوتا ہے اور سندھانوالیہ سرداروں کے قتل، راجہ ہیرا سنگھ کے وزیراعظم بننے اور رانی جنداں کے گدی پر براجماں ہونے (۱۹۴۳ء) پر اختتام ہو جاتا ہے۔ شاعری کے اعتبار سے یہ بہت کمزور ہے لیکن تاریخی ریکارڈ کے حوالے سے اسے قابل ذکر قرار دیا جا سکتا ہے۔

اسی طرح چند اور نظمیں بھی ہیں جن کا ذکر نہ ہونے کے برابر ہے۔ صرف ایک ہندی وار میں ۱۹۴۳ء کے اہم واقعات پر نظر پڑتی ہے لیکن ہندی میں ہونے کے سبب وہ یوں بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے۔

البتہ پنجابی کے کچھ ڈھولے مدکی اور سبھراؤں کی جھڑپوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ گانے والوں کے بیان کے مطابق انہیں نورا نہنگ نامی ایک شاعر نے لکھا تھا۔ ان ڈھولوں میں یہ بتانے کی کوشش کی گئی ہے کہ اگرچہ ٹوپی والا صاحب لندن سے اترا ہے اور وہ لندن سے مزید کمک منگوانے کی دھمکیاں دیتا ہے لیکن سکھوں نے بھی کوئی بزدلی نہیں دکھائی۔ ایک اور ڈھولے میں جنداں رانی کی فریاد اور رنجیت کو دی جانے والی دہائی کا ذکر ملتا ہے:

کال بلیندی

نارو وی اٹھیا ہے ہو کے گہرا

اوہناں دی بات نہ کائی' جیہناں دے جوبن دا گیا ڈھل دوپہرا

لندنوں لتھا اے صاحب ٹوپی آلا' سکھاں نے مدکی جا مریانی

لاٹ چا کیتا نیں کم نیارا

.....

پھیرو شہرنوں فرنگیاں گل چا گھتے نیں

لاٹ پیا آہندا : لندنوں فوجاں ہور آونیاں نوں' سنو بات ہمارا

جیہناں دا چا نہ سکنا ملکھاں نے بھارا

سکھ وی چتو ناہیں' لڑے نیں کر کے چارا

.....

اوس دہاڑے اوڑکاں دیاں سکاں لبھیاں نیں' سبھراواں دی جا

تے کیتا نیں چانتارا

ہک دہاڑے ہر کہیں مر جاونا ایں' وگنا نیں کوچ نگارا

.....

کال بلیندی

جندو رانی کوکے وچ بازار دے

اپڑھیاں گوٹیاں پٹیاں نیں لٹیا سردا سائیں

پھیاں تقدیراں' کھوٹے وی لیکھ ہوئے نیں بندی نار دے

لیو نیں پھد فرزند نوں' جیتو آں دی ڈٹھے نیں مونہہ چتو آں دی ہار دے

قلعیوں کڈھ سپاہی وی پھد کھلار دے

پئے مینڈھیاں تروڑ کے سٹے وی موتی ہار دے

فرنگی پیا آہندا: ترکڑیاں رہنا اوہ مائی جندو

اسیں نیک اولاد مسیح دی، واہے سٹ گھت پنجاب دی بار دے

کہیا شہر لاہور دا کراڑ کاندو، مجھیں چریندے جٹ وی وچ بار دے

رب نوں بڑی اے رانی، اس وین کیسے نیں قہر دے

اوہ مڑ مڑ سد مریندی "حال اوہ شاہ پنجاب آ"

ملتان کی وار

بھیرو وال کے معاہدے (مارچ ۱۹۴۶ء) کے بعد پنجاب کی آزادی کے گرد گھیرا تنگ ہوتا گیا۔ دوسری پنجابی جنگ (۴۹-۱۸۴۸ء) نے پنجاب کی برائے نام آزادی کا بھی خاتمہ کر دیا۔ رام نگر، سعد اللہ پور، چیلیانوالہ اور گجرات میں جو معرکے گرم ہوئے، وہ پنجاب دربار کے دکھ بھرے ڈرامے کا ڈراپ سین ثابت ہوئے ان جنگوں کا ہیرو اور مرکزی کردار شیر سنگھ تھا جس نے انگریزوں کے خلاف عوامی جنگ کی قیادت کی۔

مقامی لوگ شیر سنگھ کی کایا پلٹ کی دلچسپ کہانی سناتے ہیں۔ وہ ہزارہ کے ناظم چتر سنگھ اٹاری والا کا بیٹا اور رنجیت سنگھ کا سالا تھا۔ انگریزوں کو خدشہ تھا کہ چتر سنگھ کی طاقت پنجابی دربار کے حق میں استعمال ہو گی اس لئے انگریزوں نے سازش کر کے اسے آزادی کا اعلان کرنے پر مجبور کر دیا تاکہ اسے تنہا گھیر کر ختم کیا جا سکے۔ اس کا بیٹا اپنی فوج کے ساتھ ملتان کے قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا۔ جب اسے اپنے باپ کے خلاف انگریزوں کی کارروائیوں کا علم ہوا تو اس نے قلعے کا محاصرہ اٹھا کر، ملتان کے ناظم دیوان مولراج کی مدد کرنے کی پیشکش کی۔ کل تک جو شخص دشمن تھا، آج اسے دوست کیسے مان لیا جاتا۔ اس بنیاد پر اسے قلعہ کے اندر اور دیوان مولراج کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف لڑنے کی اجازت نہ ملی۔ وہ مایوس ہو کر ملتان سے پلٹا اور انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔ پنجاب کے بپھرے ہوئے عوام اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کی فوج میں راتوں رات اضافہ ہونے لگا۔ کئی معرکوں

میں انگریزوں کو زچ کرنے کے بعد وہ رسول نگر کے قریب اپنے باپ کی فوجوں سے آ ملا۔ اب چالیس ہزار سپاہی اس باپ بیٹے کی قیادت میں چیلیانوالہ کے قبرستان میں ایک بڑی یادگار نصب ہے جس کے مطابق انگریزی فوج کے چھ ہزار انتیس سپاہی کھیت رہے۔ انگریز شکست کھا کر بھاگے اور اپنے سپاہیوں کی لاشیں تک وہیں چھوڑ گئے۔ برطانیہ میں یہ شکست ایک قومی سوگ بن گئی۔ سر چارلس نیپئر' جو ۱۸۴۳ء میں سندھ فتح کر چکا تھا' نیا کمانڈر انچیف بنا کر بھیجا گیا تاکہ پنجابیوں سے اس شکست کا بدلہ لیا جا سکے۔۔

یہ فتح پنجاب کو بہت مہنگی پڑی کیونکہ انگریزی سپاہ نے اپنی تمام امکانی قوتیں اگلی جنگ میں جھونک دیں۔ پنجابی فوج کے پاس گولہ بارود ختم ہو چکا تھا۔ ۲۱ فروری ۱۹۴۸ء کا منحوس دن پنجاب کی آزادی کے خاتمے کا اعلان بن گیا۔ شیر سنگھ چند جانثاروں کے ساتھ نئے وسائل کی تلاش میں مارا مارا پھرتا رہا اور ۱۴ مارچ مانکیانوالہ (راولپنڈی) میں اس نے اپنی تلوار انگریز افسر کے قدموں میں پھینک دی۔ اس کی تقلید میں دوسروں کے ساتھ ساتھ ایک بوڑھے سپاہی نے اپنی تلوار کو بوسہ دے کر گلبرٹ کے قدموں میں رکھتے ہوئے رندھی آواز میں کہا:

"رنجیت سنگھ دراصل آج مرا ہے"

گذشتہ صفحات میں ہم نے شیر سنگھ کے ہاتھوں قلعہ ملتان کے محاصرے کا ذکر کیا ہے۔ یہ پنجاب کی جنگ آزادی کا دوسرا محاذ تھا جہاں دیوان ساون مل کا بیٹا دیوان مولراج بادل نخواستہ آزادی کی لڑائی میں کود پڑا تھا۔

دیوان ساون مل ملتان کے عوام کا محبوب حکمران تھا۔ اس کا بیٹا مولراج بھی باپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عوام کے دلوں میں بسنے لگا تھا۔ باپ بیٹے کے ستائیس سالہ دور میں لوگوں نے سکھ چین کا سانس لیا تھا۔ عوام ان سے پہلے مقرر کئے گئے ظالموں کی لوٹ مار سے بہت بیزار اور متنفر تھے۔ اس ستائیس سالہ دور میں انہیں طویل مدت کے بعد امن و امان میسر ہوا۔ اس پورے عرصے میں ملتان اور اس کے گردونواح کا علاقہ عملاً خود مختار تھا' سوائے خراج ادا کرنے کے ان کا پنجاب حکومت سے دوسرا کوئی تعلق نہیں تھا۔ باپ کے مرنے کے بعد مولراج کو دیوانی کا پروانا سابقہ شرائط کی بنیاد پر عطا کیا گیا تھا۔ البتہ پنجاب دربار نے تیس لاکھ روپے کا نذرانہ طلب کیا تھا۔ دیوان کے کچھ مطالبات تھے۔ انگریز ریذیڈنٹ نے جب وہ پورے کرنے سے انکار کر دیا تو مولراج نے غصے میں دیوانی کے عہدے

سے استعفیٰ دے دیا۔ مولراج سے دیوانی کا چارج لینے کے لئے جب پنجاب دربار کے افسر ملتان پہنچے تو لوگوں نے پنجاب دربار کے اس اقدام کو اپنی توہین سمجھا اور دو انگریز افسروں کو قتل کرنے کے بعد بغاوت کا اعلان کر دیا۔ انگریزوں کے خلاف ملتان کے عوام کی یہ جنگ بیرونی حملہ آوروں کے خلاف عوامی جنگ کی شکل اختیار کر گئی اور تقریباً دس ماہ تک جاری رہی۔[17]

یہ جنگ معاہدہ بھیروال کے دو سال بعد شروع ہوئی۔ ۱۹ اپریل ۱۸۴۸ء کو یہ افسر ملتان پہنچے۔ مولراج نے انہیں قلعے میں بلا کر خزانے کا چارج حوالے کر دیا۔ پرانی ریت پر عمل کرتے ہوئے قلعہ کی چابیاں بہاؤ الدین ذکریا کے مزار پر رکھ دی گئیں۔ نئے ناظم نے چابیاں وہاں سے اٹھا لیں۔ اس کام سے فارغ ہو کر مولراج لاہور دربار سے آئے ہوئے افسروں کے ہمراہ قلعہ سے باہر نکلا۔[18]

جب مولراج قلعے کا چارج دے کر کاہن سنگھ اور انگریز افسروں کے ساتھ قلعہ سے باہر آیا تو دروازے کے باہر پہلے سے موجود مشتعل ہجوم میں سے نکل کر امر سنگھ ڈوگرے نے اگنیو پر حملہ کر دیا اور کوئی دوسرا شخص اینڈرسن پر ٹوٹ پڑا۔ دونوں انگریز افسر حملہ آوروں کے ہاتھوں شدید زخمی ہو گئے۔ کاہن سنگھ ان دونوں کو پالکی میں ڈال کر فوجی دستے کی حفاظت میں عید گاہ لے گیا جہاں دربار کی فوج پڑاؤ ڈالے بیٹھی تھی۔

ملتان میں لوگوں نے بغاوت کا اعلان کر دیا۔ پہلے تو مولراج اس بغاوت میں شامل ہونے سے گریز کرتا رہا بلکہ اس کا ایک رشتہ دار رام رنگ باغیوں کو روکنے کی کوشش میں جان ہی سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ رات کو باغیوں نے عید گاہ کیمپ پر حملہ کر کے دونوں انگریز افسروں کو قتل کر دیا اور کاہن سنگھ کو گرفتار کر لیا۔ مولراج بغاوت سے سراسیمہ تھا اور اس شورش سے الگ تھلگ رہنا چاہتا تھا لیکن نہ چاہنے کے باوجود اسے بھی آندھی پر سواری کرنی پڑی۔ باغیوں کو ہمیشہ لیڈر کی ضرورت ہوتی ہے۔ سو ملتانیوں نے اسے قیادت فراہم کرنے پر مجبور کر دیا۔[19]

جب مولراج نے بغاوت کا فیصلہ کر ہی لیا تو پھر اس نے بہادری کا ثبوت دیتے ہوئے بے جگری کے ساتھ باغیوں کی راہبری کی۔ اس کے تمام اطراف پیغام بھیجنے پر ہندو، مسلمان اور سکھ مذہبی گروہ بندیوں سے آزاد ہو کر انگریزوں سے اپنی آزادی چھیننے کے لئے جنگ میں کود پڑے۔ جنگ مقامی لوگوں اور انگریزوں کے درمیان آزادی کی

جنگ میں تبدیل ہو گئی۔

لیفٹیننٹ ایڈورڈز اس وقت ڈیرہ اسماعیل خان میں تھا۔ اس نے مذہبی تضادات کا حربہ استعمال کرتے ہوئے ڈیرہ اسماعیل خان کے پٹھانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کے خلاف بھڑکایا۔ پٹھان رنگروٹ بھرتی کئے اور مقامی غداروں کو لے کر ملتان کی طرف کوچ کر دیا۔ اس وطن دشمن کام میں جن لوگوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا وہ تھے سردار فوجدار خان علی زئی (جسے ملتان پر قبضہ کرنے کے بعد خطاب' پنشن اور جاگیر ملی) غلام سردار خان خاکوانی اور ملتان کے افغان سردار غلام مصطفیٰ خان وغیرہ۔ نواب بہاول خان والئی بہاولپور نے بھی اس جنگ میں انگریزوں کے دوست کی حیثیت سے زیادہ سے زیادہ مدد کی۔ اس کا سپہ سالار فتح محمد غوری آٹھ ہزار سپاہی' گیارہ بڑی توپیں اور تین سو چھوٹی توپوں سمیت انگریزوں کی مدد کے لئے ملتان آیا۔ ملتان پر حملہ آور فوج انگریز افسروں کے سوا زیادہ تر دیسی سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ ۲۰

لیفٹیننٹ ایڈورڈز نے پہلے ڈیرہ غازی خان میں مقامی غداروں کو ساتھ ملا کر ملک کی آبرو کے محافظوں کو شکست دی اور دریائے سندھ کے پرلے علاقے پر قابض ہو گیا۔ ڈیرہ غازی خان کی شکست سے لڑائی کا پانسہ پلٹ گیا۔ اگر یہ علاقہ مولراج کے قبضے میں رہتا اور شمالی علاقے کے باغی دیوان مولراج سے آن ملتے تو ممکن تھا کہ دونوں مل کر لاہور کے دروازے تک فوجیں لے جانے میں کامیاب ہو جاتے۔

۱۸ جون ۱۸۴۶ء کو لیفٹیننٹ ایڈورڈز نے امیر بہاولپور کی افواج کی مدد سے مولراج کو کنیری کے مقام پر شکست دے کر قلعہ بند ہونے پر مجبور کر دیا۔ ۲۰ جون کو شجاع آباد کے قلعہ دار نے انگریز فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے۔ اب ملتان کو ایک طرف لیفٹیننٹ ایڈورڈز کی فوجوں نے اور دوسری طرف جنرل وہش اور راجہ شیر سنگھ کی فوجوں نے محاصرے میں لے لیا۔ ان کے پاس قلعہ کی دیواروں کو مسمار کرنے کے ذرائع نہیں تھے اس لئے محاصرے کا وقت طویل ہو گیا۔ ۷ ستمبر کو ملتان کا پہلا محاصرہ شروع ہوا تھا لیکن جب راجہ شیر سنگھ نے اپنے والد کی بغاوت کی خبر سن کر اپنی فوج انگریز کیمپ سے الگ کر لی تو یہ محاصرہ بھی اٹھا لیا گیا۔ ۲۱

ملتان کا دوسرا محاصرہ ۲۱ دسمبر ۱۸۴۸ء کو بمبئی سے بریگیڈیئر ڈنڈاس کے فوج لے کر ملتان پہنچنے کے بعد ۲۷ دسمبر

۱۸۴۸ء کو شروع کیا گیا۔ اس محاصرے کے دوران ملتانیوں نے جنگ جیتنے کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دی لیکن انگریز توپخانے کی شہر پر مسلسل گولہ باری سے ایک آفت برپا ہو گئی۔ ۳۰ دسمبر کو شہر کے اندر موجود بارود کے ذخیرے پر گولہ گرنے سے ۱۶ ہزار پاؤنڈ وزنی بارود زوردار دھماکے سے پھٹا۔ اس سے اردگرد واقع مکانات بمعہ جامع مسجد اور نواب مظفر خان کی حویلیوں کے بنیادوں سمیت ہوا میں اڑ گئے۔ پانچ سو آدمی موقعہ پر ہلاک ہو گئے اور ہزاروں کی تعداد میں زخمی ہو گئے۔ اگلے روز ایک گولہ شاہی گودام پر گرنے سے ہزاروں من اناج جل کر خاک ہو گیا۔ ۳ جنوری کو انگریزی فوج خونی برج کے قریب دیوار توڑ کر شہر میں داخل ہو گئی اور ملتان کے گلی کوچوں میں دست بدست لڑائی شروع ہو گئی۔

مولراج پست ہمتی کا مظاہرہ کئے بغیر قلعہ بند ہو گیا۔ اس نے ایک مرتبہ انگریزوں سے گفت و شنید کی کوشش بھی کی لیکن جنرل وہش کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ بغیر کسی شرط کے ہتھیار ڈال دے۔ مولراج اس پر رضامند نہ ہوا۔ قلعہ کی کڑی ناکہ بندی ہو گئی۔ قلعہ کے محاصرے اور کڑی ناکہ بندی کی وجہ سے جب رسد کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور قلعہ میں محصور باشندوں کا برا حال ہوا تو وہ ۱۹ دنوں کے بعد ۲۲ جنوری کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔ مولراج کو گرفتار کرنے کے بعد اس پر مقدمہ چلایا گیا۔ پہلے اسے سزائے موت کا فیصلہ سنایا گیا مگر پھر اسے عمر قید میں بدل کر رانی جنداں کی طرح بنارس منتقل کر دیا گیا۔ اس کا انتقال جیل ہی میں ہوا۔[۲۲]

اس پس منظر میں سوبھا شجاع آبادی کی "مولراج دی وار" شاہ محمد کی وار کے برعکس ایک دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ شاہ محمد اور مٹک کی واریں انگریزوں کی غاصبانہ پالیسیوں پر تنقید کے ساتھ ساتھ اپنوں کی غداریوں کو بھی بے نقاب کرتی ہیں جبکہ سوبھا کی وار میں نہ صرف انگریزی سپاہ کی بہادری اور انصاف پسندی کو سراہا گیا ہے بلکہ انگریزوں کا ساتھ دینے والے مقامی حکمرانوں کی عظمت اور بہادری کے بھی گن گائے ہیں۔ "مول راج دی وار" کا آغاز ہی ان لفظوں سے ہوتا ہے:

"انگریزوں نے کوشش کی اور ملتان پر چڑھ آئے
انگریزوں نے اس طرح سے مولراج سے بات کی

انگریزوں نے پنجاب کے تمام گورنر موقوف کر دیئے ہیں۔

تم اپنی فوج ہٹاؤ اور دوسروں کی ملکیت چھوڑ دو۔"[۲۳]

انگریز مولراج سے اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ انہیں قلعہ اور دوسرے مقامات دکھائے۔

"قلعہ اور شہر کی خانقاہوں کو دیکھ کر انگریزوں نے مولراج سے پوچھا یہ گنبد کیا ظاہر کرتے ہیں اور ان عمارات کو کس نے بنایا ہے۔

مولراج نے جواب دیا کہ یہ پیران عظام کی خانقاہیں ہیں جنہوں نے ملک کو بنایا اور آباد کیا ہے۔

اس کے جواب میں انگریزوں نے کہا کہ ہم اپنے گرز کی ایک ہی ضرب سے ان مزارات کو خاک میں ملا دیں گے۔"[۲۴]

مولراج کو انگریزوں کی یہ بات ناگوار گزرتی ہے' وہ تیز گھوڑا دوڑا کر ان سے آگے نکل جاتا ہے۔ اس کا یہ عمل انہیں اپنی توہین محسوس ہوتا ہے۔ انگریز اسے مارنے کے لئے چابک لہراتا ہے لیکن مولراج گھوڑا تیز دوڑاتا ہوا دور نکل جاتا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر غیرت کا مارا ایک سپاہی انگریزوں پر برچھی سے حملہ کرتا ہے اور تیز رفتاری سے بھاگ جاتا ہے۔ دیوان مولراج محسوس کرتا ہے کہ وہ ایک ناپسندیدہ صورت حال میں الجھ گیا ہے۔ مشیر اسے بتاتے ہیں کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں:

"تمہارا خزانہ جتنے برس بھی خرچ کیا جائے' کم نہیں ہو سکتا۔ تم ملتان' شجاع آباد' مظفر گڑھ بیکار میں مت گنوا دو گورکھوں نے بھی ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور پٹھانوں نے بھی ملتان کے دفاع کی ذمہ داری قبول کی۔

ہندو اور سکھ کمر باندھ کر مولراج کی توپوں پر آ گئے۔"[۲۵]

چنانچہ انگریزوں سے جنگ کی تیاریاں ہونے لگیں۔ سامان رسد اکٹھا کیا جانے لگا۔ فوجیوں کی تنخواہیں بڑھا دی گئیں۔ سوبھا شجاع آبادی کے بقول انگریز دم بخود تھے کہ مولراج نے بغاوت کی جرات کیسے کی۔ اس حیرت کا اظہار کرتے ہوئے شاعر کا لہجہ مولراج کے لئے خاصا توہین آمیز ہو جاتا ہے:

"اس واقعہ کو سن کر' دھوتی باندھنے والے ہندو کی اس حرکت پر کسی کو یقین نہ آتا تھا۔

جو ملک میں فتور پھیلاتے ہیں' وہ بادشاہوں سے مار کھاتے ہیں۔"[۲۶]

اس کے بعد شاعر نواب بہاولپور سمیت انگریزوں کے تمام حلیفوں کے قصیدے پڑھتا ہے۔ ان کی تعریف اتنی مبالغہ آمیز اور مضحکہ خیز ہوتی ہے کہ اس پر بے اختیار ہنسنے کو جی چاہتا ہے:

"جب نواب بہاولپور کے پاس اس واقعہ کے بارے میں انگریزوں کا مراسلہ پہنچا تو اس نے چوم کر اسے آنکھوں سے لگا لیا۔

نواب نے خزانے کھول دیئے اور بہت سی فوج اکٹھی کر لی....."[۲۷]

شجاع آباد کا یہ شاعر بڑے فخریہ انداز میں نواب بہاولپور کی جنگی تیاریوں کا ذکر کرتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ نواب نے کیسے نزدیک اور دور سے' اپنے حلیفوں کو اس میں انگریزوں کی طرف سے لڑنے کے لئے تیار کیا۔ جنگ کے لئے جانے والی فوج کا کماندار مقرر کیا۔ پھر اپنے مقام سے کوچ کر کے گویں کے مقام پر خیمہ زن ہوا۔ اب نواب کی بہادری کا بیان ملاحظہ ہو:

"جب بہاولپور کی فوج کے کمپ سے توپیں اور غبارے چلائے گئے تو شجاع آباد لرزنے لگا۔

"(بہاولپور) کی فوج کا نقارہ' دین کا نقارہ تھا۔"[۲۸]

پھر شاعر بیان کرتا ہے کہ سکھ فوج اس علاقے سے واقف نہ تھی۔ ایک نجاری مرد نے انہیں ایک بنجر بیابان میں گمراہ کر دیا۔ گرد و غبار کے سبب وہ اپنا راستہ گم کر کے توپوں کی زد میں آ گئی۔ شاعر بتاتا ہے کہ کیسے وہ صحراؤں میں گرمی' بھوک اور پیاس سے بھٹک کر ختم ہو گئے۔ ان کی ہڈیاں ان میدانوں میں رل گئیں اور ان کی روح جنگلوں میں پریشان ہو گئی۔ ان کے برعکس انگریزی سپاہ کا حال سنئے:

"میں انگریز کی تعریف کرتا ہوں جو ملک کو روندتا ہوا یہاں تک چڑھ دوڑا۔

"ایڈورڈ نے ٹوانے کو مطیع کیا اور سیال کا سر جھکا دیا۔

"ڈیرہ (اسماعیل خان) اس کے سامنے نہ ٹھہر سکا اور اس نے سانگڑھ میں شور مچا دیا۔

"وہ جلدی سے دوڑتا ہوا' سکھوں پر ایک پہر میں حملہ آور ہو گیا۔

"انہوں نے سکھوں کو اس طرح گھیرا جس طرح مچھلی جال میں پھنس جاتی ہے۔

"وہ یوں حملہ آور ہوئے جیسا بھیڑیا' بھیڑوں کے گلہ پر حملہ کرتا ہے۔"[۲۹]

آخری اور فیصلہ کن معرکے کا ذکر کرتے ہوئے شاعر مولراج کے عزم کا اعتراف کرتا ہے:

"مولراج بھی ملتان سے نکل آیا اور سامنے اپنا کمپ لگا دیا

"اس نے کہا میں آخر دم تک لڑوں گا اور شکست کی صورت میں چاٹنے کی غرض سے) انگلیوں میں ہیرا پہن لیا۔"[۳۰]

مولراج اپنے بہت سے سرداروں کی موت کے بعد مجبوراً قلعے میں محصور ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف نواب کی سرگرمیاں جاری ہیں:

"نواب نے اپنا تمام قبیلہ جنگ پر لگا دیا ہے

"اس نے باربرداری کے لئے ہزاروں اونٹ پکڑوا لئے

"اس کے گاڑی بان تمام بھوسہ' گھاس اور سوکھی جوار اٹھا لائے

"تمام گندم پر قبضہ کر لیا۔ قحط کی صورت پیدا ہو گئی۔"[۳۱]

انگریزی فوج ملتان کے قریب پہنچ کر قلعہ کا محاصرہ کر لیتی ہے:

"غبارے اور توپوں کے گولے بارش کی طرح برس رہے تھے

"گولے خانقاہوں کو تباہ کر رہے تھے اور یہی رضائے الٰہی معلوم ہوتی تھی۔

"گوروں کے سامنے جو بھی آیا' جان بچا کر نہ جا سکا

"ملتان کے عوام بہت خراب ہوئے' وہ جابجا رل گئے۔"[۳۲]

چاروں طرف سے گھیر لئے جانے کے بعد' مولراج اپنے مشیروں کو جمع کرتا ہے۔ سپاہی بھی اس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہیں اور وہ ہاتھ ڈالنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ وہ گلے میں کپڑا ڈال کر انگریز جنرل کی خدمت میں پہنچتا ہے:

"شاعر کہتا ہے کہ اس دھوتی باندھنے والے ہندو نے ملک گنوا دیا۔ اہل کتاب ہمارے مالک ہو گئے۔

"اب امن کا زمانہ آگیا ہے۔ شیر اور گائیں ایک ہی جگہ آپس میں پیار سے کھیلیں گی۔"[۳۳]

تاریخی واقعات کے حوالے سے شاعر کے بیان میں کافی غلط بیانیاں ہیں۔ شعر بے رس اور کمزور ہیں اور انگریزوں کے لئے شاعر کی جانبداری واضح ہے اس کے باوجود یہ مثنوی یا وار اس اعتبار سے اہم ہے کہ ان واقعات کے حوالے سے وہ اب تک دریافت ہونے والی واحد وار ہے۔

حوالے

۱۔ عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملہ آور، لاہور، ۱۹۹۰ء، صفحات ۱۱۴۔۱۱۵

۲۔ ایضاً، صفحات ۱۱۵۔ ۱۱۶

۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۷

4- Serebrayakov, Punjabi Literature, p.57

۵۔ محمد آصف خان (مرتب) جنگ ہند پنجاب، لاہور، صفحہ ۱۱۹

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۸

۷۔ ایضاً، صفحہ ۱۱۹

۸۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (مرتب) سکھاں دی وار، پنجابی ادبی اکیڈیمی، لہور، صفحہ ۱۶۰

۹۔ محمد آصف خان، جنگ.... صفحہ ۱۱۹

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۰

۱۱۔ ایضاً، صفحات ۱۲۰۔۱۲۱

۱۲۔ ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، سکھاں دی وار، صفحہ ۲۷

13- Serebrayakov, Punjabi Literature, P.57

۱۴۔ پریتم سنگھ کیہبو، سوتنترتا سنگرام دی پنجابی کوتا، کھوج درپن، جلد ۹، شمارہ ۱، فروری ۱۹۸۲ء، گورو نانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، صفحہ ۹۸

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۹۹

۱۶۔ محمد آصف خان، جنگ ہند پنجاب، صفحہ ۱۰۰

۱۷۔ عزیز الدین احمد، پنجاب....، صفحہ ۱۲۴

۱۸۔ ایضاً، صفحات ۱۲۵۔۱۲۶

۱۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۶

۲۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۷

۲۱۔ ایضاً، صفحہ ۱۲۸

۲۲۔ ایضاً، صفحات ۱۲۸۔۱۲۹

۲۳۔ عمر کمال خان ایڈووکیٹ (مرتب) ملتانی واراں، ملتان، ۱۹۹۱ء، صفحات ۳۶۔۳۸

۲۴۔ ایضاً، صفحات ۳۹۔۴۰

۲۵۔ ایضاً، صفحات ۴۴۔۴۵

۲۶۔ ایضاً، صفحہ ۵۰

۲۷۔ ایضاً، صفحات ۵۱۔۵۲

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۶۲

۲۹۔ ایضاً، صفحات ۶۷۔۷۵

۳۰۔ ایضاً، صفحات ۷۹۔۸۰

۳۱۔ ایضاً، صفحہ ۸۴۔۸۶

۳۲۔ایضاً، صفحات ۹۲۔۹۶

۳۳۔ایضاً، صفحات ۱۱۰۔۱۱۱

۳۔

تیسرا باب

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور پنجابی شعری مزاحمت

پنجاب کے حوالے سے یہ بات خاصے زور و شور سے پھیلائی جاتی رہی ہے کہ اس خطہ زمین نے ہمیشہ حملہ آوروں کے قدم چومے ہیں اور پنجابی حب الوطنی کے جذبے سے عاری ہیں۔ یہ بات کتنی سچ ہے اس کا اندازہ گذشتہ دو ابواب میں بیان کی جانے والی تفصیلات سے کیا جا سکتا ہے۔ پنجاب کے بارے میں یہ الزام بھی بار بار دہرایا جاتا ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پنجاب نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور دہلی کی فتح میں پنجابی فوجوں نے اہم کردار ادا کیا۔

غیرجانبدارانہ نظر اور معروضی حقائق کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس الزام میں صرف اتنی صداقت ہے کہ پنجاب کا ایک دھڑا یقیناً انگریزوں کا حامی اور مددگار تھا۔ وہ دھڑا حکمران طبقوں کا تھا۔ ریاستوں کے والیوں کا تھا۔ ملتان کی جنگ کے حوالے سے گذشتہ باب میں ہم بہاولپور کے نواب کی انگریز دوستی کا ذکر کر چکے ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ، نواب بہاولپور اور بعض ریاستوں کی فوجیں یقیناً انگریزوں کا دم بھر رہی تھیں۔ لیکن نوابوں اور مہاراجوں کے اس عمل کو پنجاب کے عوام کا عمل قرار دینا انصاف پر مبنی نہ ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء میں پنجابی عوام نے انگریزوں کے خلاف کئی محاذوں پر جنگ کی۔ اس ضمن میں متعدد شہادتیں دستیاب ہیں۔ سب سے پہلے تو ان انگریزی رپورٹ کو دیکھا جا سکتا ہے جن میں جگہ جگہ بغاوت پھوٹ پڑنے کی دہائی دی گئی اور متعدد چھاؤنیوں سے پنجابی فوجیوں کو غیر مسلح کیا گیا۔ پھر اس عہد کے ملکی اور غیر ملکی اخبارات ہیں جن میں سے بعض نے غیرجانبداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے حقائق پیش کرنے کی پوری کوشش کی ہے۔ ان اخبارات

میں نیویارک ہیرلڈ ٹربیون بطور خاص ذکر کے قابل ہے جس میں ہندوستان کی جنگ آزادی کے بارے میں مارکس اور اینگلز کے کالم چھپ رہے تھے۔

ایک اور اہم ماخذ ہماری لوک شاعری ہے جس میں پنجابی مجاہدین آزادی کے بارے میں سیکڑوں ڈھولے دستیاب ہیں۔ ان ڈھولوں کے شاعر' ان مجاہدین کے اپنے ساتھی یا ان کی اولادیں ہیں جو اپنے بزرگوں کی بہادری کے کارناموں کو تاریخی ریکارڈ کے طور پر محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ ہم باری باری ان تمام ماخذوں کا جائزہ لیں گے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ میں کس نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور کون ان کے مدمقابل تن کر کھڑا ہو گیا---

سب سے پہلے ہم فوجی بغاوتوں کا ذکر کریں گے۔

فوجی بغاوتیں

پنجاب میں فیروز پور اسلحہ اور سامان جنگ کا بہت بڑا مرکز تھا یہاں دیسی فوج میں مارچ ۱۸۵۷ء میں بے چینی کی لہر دوڑی ایک سپاہی نے چربی والا کارتوس استعمال کیا تو دوسروں نے اس کے ساتھ کھانا پینا بند کر دیا۔ جب میرٹھ اور دہلی سے تشویش ناک خبریں آئیں تو ایک رجمنٹ نے میگزین پر حملہ کر دیا۔ لیکن میگزین کو بچا لیا گیا۔ البتہ چھاؤنی کی بہت سی عمارتیں نذر آتش ہوئیں۔ ان میں ایک گرجا بھی تھا اس پر انگریزوں نے تیرہ افراد کو پھانسی دی اور پندرہ کو گولی ماری گئی۔[1]

انبالہ انگریزوں کی بہت بڑی چھاؤنی تھی۔ یہاں اپریل میں ہندوستانی سپاہیوں میں بے چینی کے آثار پیدا ہوئے۔ ۱۹ اپریل کو انگریزوں کے بنگلوں کو آگ لگائی گئی۔ میرٹھ کی بغاوت کی خبر پہنچتے ہی ۱۱ مئی کو حالات خاصے نازک ہو گئے اور انگریزوں نے فوراً پٹیالہ' نابھہ' مالیر کوٹلہ اور فرید کوٹ کے علاوہ جاگیرداروں اور رئیسوں سے بھی امداد طلب کی انبالہ کے خزانے میں جتنا روپیہ تھا وہ دیسی گارڈ کی نگرانی سے نکال کر گورا گارڈ کے حوالے کر دیا گیا۔ ۲۹ مئی کو نمبر ۵ دیسی پیادہ فوج کی جو کمپنیاں یہاں موجود تھیں ان سے ہتھیار لے لئے گئے۔ روپڑ میں جن کمپنیوں نے بغاوت کی تھی انہیں توڑ دیا گیا۔ جو دیسی افسر بغاوت میں شامل تھے انہیں موت کی سزا دی گئی۔ اگرچہ یہاں کوئی خاص ہنگامہ نہیں

ہوا تھا لیکن ۲۹ افراد کو موت کی سزا دی گئی اور ۱۳۵ قتل ہوئے۔[۲]

میرٹھ کے ہنگامے کی خبر یہاں ۱۱ مئی کو پہنچی۔ اسی روز ایک ہندوستانی افسر کو موت کی سزا دی گئی۔ شہر کی "حفاظت" کے لئے پھلور سے فوری طور پر توپیں منگوائی گئیں۔ کپور تھلہ قریب تھا وہاں کے راجہ نے حکومت کی ہر طرح سے امداد کی۔ ۷ جون کی رات کو فوج میں سخت بے چینی پھیلی۔ لیکن کسی قسم کی کارروائی کئے بغیر وہ چھاؤنی سے نکل گئی۔ سرکاری افسروں اور تحصیلداروں کا کام تسلی بخش تھا۔ صرف ایک تحصیلدار ضیاء الدین نے مجاہدوں کے موافق روش اختیار کی اور اسے ملازمت سے برطرف کر دیا گیا۔[۳]

لدھیانہ میں ابتدا ہی سے تشویش ناک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ڈپٹی کمشنر نے ضلع کے رؤساء کی امداد سے حالات پر قابو پائے رکھا اور خزانہ محفوظ رہا۔ ایک مولوی صاحب نے شہر کی آبادی کو جہاد پر آمادہ کیا۔ جب ادھر ادھر سے مزید ہندوستانی سپاہی یہاں آئے تو مولوی صاحب نے اپنے معتقدین کو ان کے ساتھ شامل ہونے کی ترغیب دی۔ سبز جھنڈا تیار کیا گیا اور سب لوگ دہلی روانہ ہو گئے۔ ۱۷ جون کو ڈپٹی کمشنر نے شہریوں سے ہتھیار لے لئے جن سے گیارہ گاڑیاں بھر گئیں۔ جالندھر سے فوجی یہاں پہنچے تو انہوں نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ ان فوجیوں کو صرف گولہ بارود کی ضرورت تھی دوسرے دن ان لوگوں نے قلعہ کو خالی کر دیا۔ تو ڈپٹی کمشنر نے قلعہ کے اردگرد تین تین سو گز تک سارے مکان مسمار کرا دیئے۔ ہندوستانیوں کو وہاں سے نکال دیا اور شہریوں سے جرمانہ وصول کیا۔[۴]

لدھیانہ کی بغاوت کے حوالے سے کئی عوامی داستانیں بھی مشہور ہیں جن کے مطابق اس شہر میں' مجاہدین آزادی گجروں کے محلے میں مورچہ بند ہو کر لڑے تھے۔ محلے کے گیارہ چودھریوں کو پھانسی دی گئی۔ ساری گجر برادری کو وہاں سے نکال دیا گیا۔ ان پر ۵۵۲۹۴ روپیہ جرمانہ کیا گیا' زمینیں ضبط کر لی گئیں اور مویشی نیلام کر دیئے گئے۔[۵] تین سو گز تک جن گھروں کو میدان بنا دیا گیا تھا' وہاں بعد "روشنی کا میلہ" لگنے لگا جہاں پھانسیاں چڑھنے والوں کی قبروں پر دیئے جلتے اور اکتارے پر گیت گائے جاتے۔ ایک گیت ملاحظہ ہو

انگریز دے راج توں پہلاں

ایلھے وسدے سن شیر دلیر

جیہناں ول ول مارے سی گورے

لاشاں دے لا دتے سی ڈھیر

جیہناں غازیاں اگے لیا رکھیاں سی

ددھ دیاں چائیاں

خون منگدیاں سن جیہناں دیاں لاٹھیاں

جیہناں ول ول مارے سی گورے

لاشاں دے لا دتے سی ڈھیر

جیہناں سورمیاں وڈے سی گورے

جیہناں توپاں دے گولے

سمجھے سی روڑے...

جیہڑے چھڈ میدان نہ دوڑے

ایتھے وسدے نیں اوہ شیر دلیر

جیہناں ول ول مارے سی گورے

جیہناں لاشاں دے لا دتے سی ڈھیر

جیہڑے توپاں تھیں نہ ڈرے، جیہڑے نال فرنگی

دے لڑے

جیہڑے آزادی دے شوہ وچ، بن گھڑے دے

ترے

جیہناں چم چم گلاں وچ پایاں پھانسیاں

اج دیوے نیں اوہناں دیاں قبراں تے بلے[٦]

ہوشیارپور میں آتشزدگی کی پہلی واردات ۳ مئی کو ہوئی۔ ۱۳ مئی کو دہلی اور میرٹھ کے ہنگاموں کی اطلاع پہنچی۔ ڈپٹی کمشنر نے پولیس کی تعداد فوراً بڑھا دی اور تحصیل کی عمارت کی حفاظت کے لئے توپیں نصب کرا دیں۔ سپاہیوں کے خفیہ خطوط کھول کر پڑھے گئے تو معلوم ہوا فوجیوں کے درمیان خفیہ نامہ و پیام جاری ہے۔ راستوں کی حفاظت کا زبردست انتظام کیا گیا تاکہ مقامی لوگ باہر نہ جا سکیں اور باہر کے اندر داخل نہ ہو سکیں۔[۷]

۱۲ مئی کو امرتسر میں میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچیں اور انگریزی فوج نے حفاظت کے مکمل انتظامات کر لئے۔ بیراگی فقیروں کی ایک بڑی تعداد گرفتار کر لی گئی۔ خزانہ کو قلعہ گوبند گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ چار نئی حوالاتیں قائم کی گئیں۔ سپاہیوں کو شہر میں داخل ہونے سے منع کر دیا گیا۔ نمبر ۳۵ دیسی فوج کو بغاوت کے شبہ میں غیر مسلح کر دیا گیا۔ ۹ جولائی کو نمبر ۵۹ دیسی فوج کو بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ اجنالہ کا سانحہ جس کا ذکر آ چکا ہے اسی ضلع میں پیش آیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر کوپر کی رپورٹ کے مطابق ۴۷۶ افراد قتل ہوئے۔ دو کو پھانسی دی گئی' دو کی موت قید میں واقع ہوئی اور بارہ کو قید کیا گیا۔ گرفتار ہونے والوں میں ایک معزز سکھ رہنما بھائی مہاراج سنگھ بھی تھے۔[۸] فوجی بھرتی کے دو اضلاع جہلم اور راولپنڈی میں بھی فوجوں نے سرکشی کی۔ ۷ جولائی کو جہلم کی فوج میں سے ڈھائی سو سپاہی بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ لوگ جموں جا پہنچے۔ ان لوگوں کا تعاقب کیا گیا۔ کچھ تو بھاگ کر بچ نکلے لیکن چند ایک کو گرفتار کر لیا گیا۔ کئی روز تک فوجی عدالت میں ان کا مقدمہ چلتا رہا انجام کار ان لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ جو لوگ جموں بھاگ گئے تھے' وہ بھی ایک بیان کے مطابق ختم کر دیئے گئے تھے۔

راولپنڈی کی دو رجمسوں کے ۲۶ آدمی ہتھیار لے کر بھاگ گئے۔ اکثر تعاقب میں مارے گئے۔ جو گرفتار ہوئے انہیں موت کی سزا دی گئی۔ فوجی عدالتوں سے ۱۰۸ افراد کو اور دیوانی عدالتوں سے ۲۳۷ افراد کو سزائیں دی گئیں۔[۹]

ہزارہ کی کرال قوم کے افراد نے مری پر حملے کا ارادہ کیا تو یہاں کے حالات بڑے تشویشناک ہو گئے۔ انگریزوں نے حفاظتی اقدامات دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی وسیع پیمانے پر کر لئے مری میں تین افراد کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر رسول بخش' ڈاکٹر سید امیر علی اور سید کرم علی۔

اول الذکر دو سرکاری ملازم تھے لیکن سید کرم علی قلعی گر کی حیثیت سے چکر لگایا کرتے تھے۔ سید کرم علی کو

گرفتار کیا گیا اور ۱۹ ستمبر ۱۸۵۷ء کو پھانسی دی گئی۔ ڈاکٹر رسول بخش اور ڈاکٹر امیر علی بھی گرفتار ہوئے۔ ۱۷ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو ان لوگوں نے جام شہادت نوش کیا۔[۱۰]

میانمیر لاہور کا بلیک ہول

میرٹھ اور دہلی کی خبریں پہنچتے ہی شہر کی صورت حال بگڑ گئی' افواہیں اڑنے لگیں تو شہر میں سراسیمگی پھیل گئی۔ حفاظت کے لئے نئی فوج بھرتی کی گئی۔ فقیروں' درویشوں اور بیراگیوں کو شبہ میں پکڑا جانے لگا اور حکم دیا گیا کہ لاہور کے قلعہ میں اتنی خوراک جمع کر لی جائے جو چار ہزار آدمیوں کے لئے چھ ماہ تک کافی ہو سکے۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ اگر حالات قابو سے باہر ہو جائیں تو انگریز قلعہ بند ہو سکیں۔ ۱۲ مئی کو فیصلہ کیا گیا کہ میاں میر کی دیسی فوج کو غیر مسلح کر دیا جائے۔ اس کے لئے ایسا منصوبہ تیار کیا گیا کہ چند اعلیٰ افسروں کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ اس رات کو انگریزوں نے رقص کا اہتمام کیا اور رقص جاری تھا کہ گورا پلٹن کو پریڈ کے میدان میں پہنچا دیا گیا۔ توپیں جگہ جگہ نصب کر لی گئیں اور فوجیوں سے کہا گیا کہ مختلف مقامات پر دیسی فوج نے سرکشی کر لی ہے آپ لوگوں سے ہتھیار لے لینے کا مقصد یہ نہیں کہ آپ پر اعتماد نہیں رہا۔ اصل مقصد یہ ہے کہ آپ دوسری رجمنٹوں کی پیروی کرنا بھی چاہیں تو نہ کر سکیں اور خطرے سے محفوظ رہیں۔ اس وقت انتظامات اتنے مکمل تھے کہ سپاہیوں نے بے چون و چرا اسلحہ واپس کر دیا۔

میاں میر کی غیر مسلح نمبر ۲۶ رجمنٹ کے ساتھ اس کے بعد جو سانحہ گزرا اس کی مثال شائد ہی کہیں مل سکے۔ غیر مسلح ہونے کے بعد ان لوگوں کے جذبات و احساسات بدستور تازہ رہے یہاں تک کہ ۳۰ جولائی کو رجمنٹ نے اپنے کمان افسر اور سارجنٹ میجر کو ہلاک کر دیا اور خود بھاگ نکلی اس وقت شدید آندھی آئی ہوئی تھی کسی کو معلوم نہ ہو سکا کہ فوج کدھر گئی ہے۔ اس ہنگامے کا آغاز یوں ہوا کہ ایک سپاہی پرکاش پانڈے یکایک اپنی جھونپڑی سے نکلا اور تلوار بلند کر کے پکارا "فرنگیوں کو قتل کر دو" اسی نے سب سے پہلے میجر پر حملہ کیا سکھوں کی پلٹن نے گولیاں چلانی شروع کر دیں اور اس وقت ۲۶ نمبر رجمنٹ کے سپاہی بھاگ نکلے۔ ان لوگوں کی تلاش شروع ہوئی ۳۱ جولائی کو

یہ لوگ دریائے راوی کے کنارے پہنچے اور ایک چوکیدار سلطان خان سے گھاٹ کا پتہ پوچھا' اس شخص نے ایک ہی نظر میں ان لوگوں کو پہچان لیا اور چال یہ چلی کہ اپنے آپ کو بے خبر ظاہر کیا اور کہا کہ مجھے تو معلوم نہیں البتہ میں اپنے بیٹے کو آپ کے ساتھ کرتا ہوں جو آپ کو گھاٹ تک لے جائے گا۔ بیٹے کو ان کے ساتھ کر کے خود وہ صبح آٹھ بجے پیدل بھاگا اور دس بجے اجنالہ پہنچ کر وہاں کے تحصیل دار دیوان پریم ناتھ کو اطلاع دی کہ ۲۶ نمبر رجمنٹ کے سپاہی فلاں جگہ پر موجود ہیں۔

تحصیلدار فوراً پولیس کی بھاری جمعیت لے کر فوجیوں کے تعاقب میں روانہ ہو گیا اور ایک تیز رفتار قاصد کو فریڈرک کوپر کے پاس بھیج دیا۔ جو اس زمانے میں امرتسر کا ڈپٹی کمشنر تھا۔ تحصیل دار موقع پر پہنچا تو سخت لڑائی ہوئی جس میں نمبر۲۶ کے ڈیڑھ سو آدمی کام آئے۔ باقی لوگ دریا کے بیچ میں کنارے سے ایک میل دور ایک چھوٹے سے جزیرے میں جا بیٹھے فریڈرک کوپر شام کے چار بجے امرتسر سے وہاں پہنچا کنارے پر دو کشتیاں تھیں۔ فوجیوں کو گرفتار کر کے کشتیوں میں دریا کے کنارے پر لایا گیا۔ سب فوجی گرفتار نہیں ہوئے تھے۔ بہت سے دریا میں کود کر راوی کی لہروں کے نظر ہو گئے تھے۔ اجنالہ یہاں سے چھ میل دور تھا۔ آدھی رات کو سارے قیدی اجنالہ پہنچے۔ انہیں تھانے میں بند کر دیا گیا۔ فریڈرک کوپر کا خیال تھا کہ انہیں اسی وقت موت کی سزا دی جائے لیکن سخت بارش کی وجہ سے معاملہ صبح تک ملتوی کرنا پڑا۔ صبح کو مزید چھیاسٹھ فوجی گرفتار کر کے لائے گئے۔ اب دو سو بیاسی آدمی اجنالے کے تھانے میں جمع دشمن کے آخر فیصلے کا انتظار کر رہے تھے۔ انہیں صبح کو ایک برج میں بند کر دیا گیا۔ پھانسی دینے کے لئے بہت سے رسے منگوائے گئے تاکہ زیادہ تعداد میں بیک وقت پھانسی دی جا سکے۔ ضرورت پڑنے پر سب قیدیوں کو گولی کا نشانہ بنانے کے لئے ایک اور دستہ منگوا لیا گیا۔ تھانے سے سو گز کے فاصلے پر ایک خشک کنواں تھا۔ لاشیں پھینکنے کے لئے اسے منتخب کیا گیا۔ یکم اگست کو تمام مسلمان سوار رخصت پر بھیج دیئے گئے تاکہ وہ امرتسر جا کر عید منائیں۔ یہاں صرف کوپر' تحصیل دار اور سکھ جوان یا سکھ رئیس رہ گئے۔ اجنالہ کے اردگرد سخت پہرہ لگا دیا گیا تاکہ کوئی ادھر نہ آنے پائے۔ موت کی سزا دینے کا طریقہ یہ ٹھہرا کہ دس دس کی ٹولیوں میں قیدی باہر لائے جاتے۔ ان کے نام اور پتے لکھے جاتے اور انہیں اس جگہ کی طرف روانہ کر دیا جاتا۔ جہاں سپاہی انہیں گولی سے اڑانے کے لئے

تیار کھڑے تھے۔ کوپر نے لکھا ہے کہ جب یہ لوگ مقتل کی جانب لے جائے جاتے تو غصے اور جوش کی حالت میں مجھ سے کہتے "تمہارے ساتھ بھی یہی سلوک ہو گا۔"

جب ڈیڑھ سو قیدی موت سے ہم آغوش ہو گئے تو گولی چلانے والے سکھوں کے دستے میں سے ایک کو غش آ گیا۔ چنانچہ سلسلہ قتل تھوڑی دیر کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔ دو سو بتیس قیدی مارے جا چکے تو معلوم ہوا کہ باقیوں نے برج سے باہر نکلنے سے انکار کر دیا ہے۔ خیال تھا کہ دروازہ کھلتے ہی وہ باہر کی طرف لپکیں گے اور لڑائی ہو گی۔ اس لئے پہرے کا خوب بندوبست کر لیا گیا تھا۔ لیکن بند دروازے کے پیچھے قیدی تکان، گرمی اور دم گھٹنے کی وجہ سے ختم ہو چکے تھے۔ پینتالیس لاشیں باہر نکالی گئیں۔ اجنالہ کے بھنگیوں نے انہیں بھی اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ کنوئیں میں پھینک دیا۔ اس کنوئیں پر ایک اونچی قبر بنا دی گئی اور اس کا نام انگریزوں نے "مفسد گھر" رکھا۔

لاہور کے حالات کے بارے میں ۱۴ جون کو چیف کمشنر کے سیکرٹری نے جو رپورٹ حکومت ہند کے محکمہ خارجہ کو بھیجی اس میں کہا گیا کہ "لاہور میں فوجی عدالتوں کا کام جاری ہے گیارہ قیدیوں کو ملازمت چھوڑ کر بھاگ جانے کے جرم میں موت کی سزا دی گئی ہے جسے جنرل گوون نے سزائے قید میں تبدیل کر دیا ہے۔ ۳۵ نمبر پیادہ فوج کے دو سپاہیوں کو انارکلی میں توپ دم کیا گیا ہے، کیوں کہ وہ لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے تھے۔

دہلی میں بعض اعلانات تیار کئے گئے جو لاہور بھی بھیجے گئے ایک اعلان میں جو ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی طرف سے تھا۔ اہل لاہور اور پنجابیوں سے کہا گیا:

۱۔ انگریزوں نے محاصل بہت بڑھا دیئے ہیں۔

۲۔ معزز اور تعلیم یافتہ افراد کے لئے کوئی ذریعہ معاش نہیں رہا لاکھوں افراد ضروریات زندگی سے محروم ہیں۔

۳۔ اب حکومت ہر ایک کا مذہب بگاڑنے کے درپے ہے۔ لہٰذا فوج نے ہتھیار اٹھا لئے ہیں کہ راندۂ مذہب ہو کر مرنے سے دونوں جہاں میں رسوائی ہو گی۔

۴۔ اگر انگریز اس نازک وقت پر لوگوں کو مصالحتی اعلانات سے مطمئن کرنے کی کوشش کریں تو ہرگز نہ ماننا۔ ان کے وعدوں کا کچھ اعتبار نہیں۔

۵۔ اہل پنجاب کو بھی بیدار ہونا چاہئے۔ اٹھو! عورتوں کا جامہ اتارو اور مردوں کا لباس بدل کر میدان میں آ جاؤ۔

۶۔ حکومت کو مالیہ نہ دو۔ جو شخص اپنی حکومت قائم ہونے سے پہلے مالیہ دے گا اسے پشیمان ہونا پڑے گا۔

ایک اور اعلان بھی جاری ہوا جو دہلی کے ہندو مسلمان سپاہیوں کی طرف سے لاہور کے ہندو اور مسلمان سپاہیوں کے نام تھا۔ اس اعلان میں کہا گیا تھا کہ انگریز ہمارے دشمن ہیں۔ ان سے نجات حاصل کرنی چاہئے۔ کلکتہ سے پشاور تک کے تمام سپاہی دہلی جمع ہو رہے ہیں۔

اب انتظار کس بات کا ہے؟ اگر فرنگی سپاہی تمہارے مقابلے پر آ جائیں تو انہیں ہرگز بچ کر نہ نکلنے دینا۔ جو مسلمان مرے گا وہ شہید ہو گا اور جو ہندو مرے گا وہ بیکنھ باشی ہو گا۔ ۱۲ جون کو لاہور کے شہریوں سے اسلحہ لے لیا گیا لیکن تلواریں شہریوں کے قبضے میں رہ گئیں۔[11]

سیالکوٹ اور ملتان کے معرکے

شروع شروع میں سیالکوٹ پرامن رہا۔ لیکن جولائی کے مہینے میں اچانک یہاں فوج میں ایسی بے چینی پھیلی کہ سپاہیوں نے کئی انگریزوں کو قتل کر کے گورداسپور کا راستہ لیا۔ غالباً یہ لوگ دہلی جانا چاہتے تھے۔ اسی دوران میں جنرل نکلسن اپنے متحرک کالم کے ساتھ امرتسر پہنچا اسے جب علم ہوا کہ فوجی گورداسپور روانہ ہو گئے ہیں تو وہ بھی امرتسر سے گورداسپور کی طرف بڑھا فوجیوں نے ۱۲ جولائی کو گورداسپور سے نو میل اوپر راوی کو عبور کیا اسی مقام پر نکلسن نے ان پر حملہ کیا۔ تین سو کے قریب قتل یا زخمی ہوئے اور جو بچ نکلے انہوں نے جسروتہ (جموں و کشمیر) کا رخ کیا' حکومت جموں و کشمیر نے ان لوگوں کو گرفتار کیا اور چھ سو آدمی انگریزوں کے سپرد کر دیئے۔ ان میں بہت سے صرف سائیس اور عام ملازم تھے۔ ایک سو چھبیس فوجی تھے۔ ان سب کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

لاہور کی طرح سیالکوٹ میں بھی دو اعلان باغ کے دروازوں پر لگائے گئے۔ جن میں لوگوں کو انگریزوں کے خلاف ابھارا گیا تھا۔ ان میں سے ایک اعلان جس میں انگریزوں کو مخاطب کیا گیا تھا وہ یہ تھا۔

"تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جب میں لاہور کی طرف کوچ کروں گا تو تمہارے لئے بچ نکلنا مشکل

ہو جائے گا۔ اس لئے کہ پنجاب کی فوج پوری کی پوری میرے ساتھ ہو جائے گی۔ یقین رکھو! پنجاب کبھی تمہاری ملکیت نہیں ہو سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ اس صوبے میں تمہاری ہڈیاں پیسی جائیں گی۔ تم اپنی بھلائی پہچانو تو فوراً یورپ چلے جاؤ۔"

لاہور اور سیالکوٹ کے ان اعلانوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگ کس قدر مشتعل تھے اور غیر ملکی آقاؤں کے خلاف ان کے کیا ارادے تھے۔[۱۲]

ملتان میں دیسی فوج سے ۱۸ جون کو ہتھیار لے لئے گئے۔ گوگیرہ (منٹگمری) میں جو فوج مقیم تھی اسے بھی غیر مسلح کر دیا گیا۔ جس روز ملتان میں فوج سے ہتھیار لئے گئے اس روز رجمنٹ نمبر ۶۹ کے چار سپاہی بھاگ گئے۔ ان میں سے ایک پکڑا گیا اور اسے موت کی سزا ملی۔

پھانسی سے ایک رات پیشتر اس سپاہی نے جان بخشی کے وعدے پر تمام راز افشا کئے۔ اس پر ناہر خاں صوبیدار میجر اور بعض دوسرے افراد کو گرفتار کیا گیا۔ ناہر خان پر ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو الگ مقدمہ چلا اور اسے ۲۴ جولائی کو پھانسی دی گئی۔ ناہر خاں کے سوا دس آدمیوں پر مقدمہ چلا اور انہیں بھی موت کی سزا ملی۔[۱۳]

مارکس کی شہادت

پنجابیوں کی خوش قسمتی سے، لندن میوزیم میں بیٹھا ایک جرمن فلسفی مارکس ہندوستان کی جنگ آزادی کو پوری توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ جنگ آزادی سے صرف آٹھ سال قبل انگریزوں اور پنجابیوں کے درمیان ہونے والی لڑائیاں بھی اس کے سامنے تھیں۔ اس نے چیلیانوالہ کی لڑائی میں ۲۳۰۰ انگریزوں کے مرنے کی خبر بھی ریکارڈ کی تھی اور اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ پنجاب کی فتح نے ہندوستان میں آزاد حکومتوں کے تصور کو ماضی کی ایک یاد بنا دیا تھا۔ اپنے ایک مضمون "ہندوستانی فوج کی بغاوت" میں اس نے لکھا تھا:

"سندھ اور پنجاب کی فتح سے برطانوی ہندوستانی سلطنت نہ صرف اپنی اصلی سرحدوں تک پھیل گئی بلکہ اس نے خود مختار ہندوستانی ریاستوں کے آخری نشانات بھی مٹا دیئے۔"[۱۴]

"پنجاب میں فیروز پور کے مقام پر ۵۷ ویں اور ۴۵ ویں دیسی پیادہ رجمنٹوں نے بغاوت کی لیکن اسے طاقت کے ساتھ دبا دیا گیا۔ لاہور سے غیر سرکاری نامہ نگار لکھتے ہیں کہ پورے کا پورا دیسی رسالہ علی الاعلان بغاوت کی حالت میں ہے۔"

"۔۔۔۔۔ لیکن گھیرا ڈالنے والی فوج میں دیسی فوجوں کا آ کر شامل ہونے والا یہ حصہ بالکل ہی اور قطعی طور پر بھروسے کے قابل نہیں۔۔۔۔۔۔ یہ لوگ ایک طبقے کے طور پر بالکل ہی غیر وفادار ہیں اور فوج میں ان کا کسی گنتی میں ہونا تشویشناک بات ہونی چاہئے اور ایسا ہی ثابت ہوا۔ دوسرے پنجاب رسالے میں تقریباً ستر ہندوستانی نوجوانوں کو بے ہتھیار کرنا اور تین کو پھانسی پر چڑھانا' جن میں ایک بڑا دیسی افسر تھا' ضروری سمجھا گیا۔"

"پنجاب میں بغاوت کے جذبے کو زبردستی دبایا گیا۔ سیالکوٹ میں اور جہلم میں بغاوت کو دبایا گیا۔"

"پنجاب کے بارے میں کہا گیا کہ وہاں پر امن و امان ہے لیکن اس کے ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ فیروز پور کے مقام پر ۱۳ جون کو فوجی کارروائیاں ہوئی ہیں۔۔۔۔ یہ ماننا چاہئے کہ یہ بہت عجیب طرح کا امن و امان ہے۔"[۱۵]

"راولپنڈی سے خبر آئی کہ تین دیسی سردار سازش کر رہے ہیں۔ سر جان لارنس نے اپنے جوابی پیغام کے ذریعے حکم دیا کہ ایک جاسوس ان کے جلسے میں شریک ہو۔ جاسوس کی رپورٹ پر سر جان نے دوسرا پیغام بھیجا۔ "ان کو پھانسی پر لٹکا دو۔" اور سرداروں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔"

"پنجاب میں دیسی فوجیں توڑ کر ہی کھلم کھلا بغاوت روکی جا سکتی ہے۔۔۔۔۔ اب انگریزی فوج کی اصلی پوزیشن کا ٹھیک ٹھیک پتہ اس بات سے لگتا ہے کہ پنجاب میں اور راجپوتانے میں فلائنگ کارز قائم کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انگریز نہ ہی اپنے سپاہیوں پر اور نہ ہی دیسی لوگوں پر اپنی بکھری ہوئی فوجوں کے درمیان راستے کھلے رکھنے کے لئے انحصار کر سکتے ہیں۔"

جموں کشمیر' جنید' نابھہ' کرنال' کپور تھلہ اور کسی حد تک بہاول پور کی ریاست کے والیوں نے دلی کی فتح کے

لئے انگریزوں کو اپنی فوجیں اور مالی امداد دی۔ لیکن بعض ایسی ریاستیں بھی تھیں جنہوں نے بغاوت میں حصہ لیا اور جان و مال کی قربانی دی۔ تاریخ، جھجھر کے نواب عبدالرحمٰن خان، کلو کے پرتاپ سنگھ اور بلب گڑھ کے ناہر سنگھ کو نہیں بھول سکتی۔ جن ریاستوں نے انگریزوں کا ساتھ دیا تھا وہاں بھی تھوڑے ہی عرصے بعد جذبات میں بے چینی محسوس کی جانے لگی۔ لکھنؤ پر حملے کی تفصیلات کا جائزہ لیتے ہوئے فریڈرک اینگلز نے سکھوں کی اس تبدیلی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"اور سب سے آخر میں سکھوں نے جس انداز میں بولنا شروع کیا ہے وہ انگریزوں کے لئے نیک شگون نہیں۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی مدد کے بغیر برطانیہ کے لئے ہندوستان کو قبضے میں رکھنا مشکل ہے اور یہ کہ اگر وہ بغاوت میں شامل ہو جاتے تو ہندوستان کم از کم کچھ عرصے کے لئے انگلینڈ کے ہاتھوں سے ضرور نکل جاتا۔ یہ بات وہ کھلم کھلا کہتے ہیں اور اپنے مشرقی انداز میں بڑھا کر کہتے ہیں۔ انہیں اب انگریز نسل بڑھیا نظر نہیں آتی جس نے مدکی، فیروز شاہ اور علی وال کے مقام پر انہیں شکست دی تھی۔ اس یقین سے کھلی دشمنی تک مشرقی قوموں نے بس ایک ہی قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ ایک چنگاری ہی شعلے بھڑکا سکتی ہے۔"

"۔۔۔۔۔ ہو سکتا ہے پنجاب کو بھی پھر جیتنا پڑے لیکن اگر اچھے سے اچھے حالات بھی رہے تو بھی انہیں ایک لمبی اور پریشان کن گوریلا جنگ کا سامنا کرنا پڑے گا اور ہندوستانی دھوپ میں یورپیوں کے لئے کوئی قابل رشک بات نہیں۔"

اپنے ایک اور مضمون میں اینگلز نے لکھا تھا:

"۔۔۔۔۔ اس وقت یہ نفرت اگرچہ کمزور اور بے بس ہو، پھر بھی یہ اہمیت سے خالی نہیں جبکہ وہ خطرناک بادل سکھ پنجاب پر چھایا ہوا ہے۔"[۱۶۲]

احمد خان کھرل

مارکس نے بغاوت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون "ہند میں بغاوت" میں ایک جگہ بتایا ہے کہ

ملتان اور لاہور کے درمیان مواصلات کے ذرائع آٹھ دن تک منقطع رہے۔ مارکس کا یہ اشارہ اس مشہور بغاوت کی طرف ہے جس کے نتیجے میں انگریز ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر برکلے اور اس کے بے شمار فوجی مارے گئے تھے اور بغاوت کے لیڈروں کو خود بھی اپنی جانیں قربان کرنی پڑی تھیں۔ اس بغاوت کا مرکز بار کا علاقہ تھا اور اس بغاوت کی کہانی پنجابی لوک گیتوں کی ایک صنف "ڈھولوں" میں جگہ جگہ بکھری پڑی ہے لیکن پہلے ہم ان انگریزی رپورٹوں کو دیکھنا چاہیں گے جو جنگ آزادی کی کہانی حاکم طبقے کے نقطۂ نظر سے بیان کرتی ہیں۔

چیف کمشنر پنجاب سر جان لارنس نے حکومت ہند کے نام مندرجہ ذیل رپورٹ ارسال کی:

"اس ضلع (ساہیوال) کے تین قبیلے فتیانہ' بہاول کی سرداری میں' کاٹھیا' محمد کی رہنمائی میں جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر اٹھے۔ کھرل قبیلہ' احمد خاں کی سرداری میں بروئے کار آیا اور تینوں اکٹھے ہو کر انگریزوں سے الجھ گئے۔"

لیفٹیننٹ الفنسٹن کے پاس اطلاع پہنچی کہ فلاں فلاں قبیلے بگڑ گئے ہیں۔ اس نے فوجیں بھیجیں اور راوی کے کنارے جھڑپیں ہوئیں۔

اس کے بعد انہوں نے گوگیرہ پر سخت حملہ کیا اور نقصان پہنچایا۔ مسٹر برکلے مارا گیا اور ادھر سے خود احمد خان کام آیا۔ لیکن یہ سلسلہ جاری رہا۔ باغیوں نے ہڑپہ اور چیچہ وطنی پر قبضہ کر لیا اور چیمبرلین اور اس کی فوج کو محاصرے میں لے لیا۔ انگریزی فوجیں لاہور' ملتان اور گورداس پور سے پہنچیں اور صاحب کو محاصرے سے نکالا۔

پھر میجر چیمبرلین نے جلی پر حملہ کیا۔ یہاں پر سخت لڑائی ہوئی' اور باغیوں نے قلعے سے باہر نکل کر حملے کئے۔ اس کے بعد باغیوں کا نہایت منظم طریقے سے قلع قمع کر دیا گیا۔"

ایک اور افسر کی رپورٹ ملاحظہ ہو:

"دوسرا ہنگامہ گوگیرہ میں برپا ہوا' جو راوی اور ستلج کے درمیان لاہور کے جنوب میں واقع ہے۔ سقوط دہلی کے ساتھ ہی ۱۶ ستمبر کو محکمہ ڈاک کے ایک اہل کار نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی

آنکھوں کے ساتھ بیان کیا کہ ساحل کے ساتھ ساتھ لاہور اور ملتان کے درمیانی علاقے میں لوگ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور باغیوں کی تعداد ۱٬۲۵٬۰۰۰ ایک لاکھ پچیس ہزار ہے۔ (ضلع کی کل آبادی ساڑھے تین لاکھ تھی) تین گھنٹے کے وقفے سے ایک یورپین کمپنی' توپ خانہ اور دو سو سکھ سپاہی روانہ کر دیئے گئے تھے۔ باغی ہتھیاروں سے مسلح تھے جو انہوں نے پولیس سے چھین لئے تھے یا ملحقہ ریاست بہاول پور سے در آمد کئے تھے۔

یہ بغاوت بیس دن کی جدوجہد کے بعد فرو ہوئی جس میں ہمارا تھوڑا سا جانی نقصان ہوا۔ اس غرض کے لئے یہاں پانچ سو فوجی دستے جمع کئے گئے تھے۔ اگرچہ ان دنوں امن و امان ہے لیکن بغاوت کی وجوہ کی تحقیقات ضروری ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ جب تک دہلی ہمارے قبضے میں آیا۔ اس وقت تک بغاوت فرو نہ ہو سکی۔"

ڈپٹی کمشنر گوگیرہ لیفٹیننٹ این۔ ڈبلیو الفنسٹن کی ایک رپورٹ سے برکلے کی موت اور بغاوت کی دیگر تفصیلات کا پتہ چلتا ہے۔

"مجھے برکلے کا رقعہ ملا۔ وہ احمد خان کھرل پر قابو نہیں پا سکا۔ احمد خان اور برکلے دونوں آمنے سامنے تھے لیکن گولیوں کے زد سے باہر تھے۔

احمد خان نے شاہ دہلی کی اطاعت کا ذکر کیا تو اس کے ساتھیوں میں جوش پیدا ہو گیا۔ انہوں نے توڑے دار بندوقیں چلائیں' جن کا موثر جواب دیا گیا۔

اس اطلاع کے ساتھ لیفٹیننٹ مچل' برکلے کی مدد کو بھیجا گیا۔ صدر مقام سے قیدی اور خزانہ خالی کر کے میں خود بھی بھاری جمعیت کے ساتھ ان سے جا ملا۔"

"ہم لوگ دریا عبور کر گئے۔ دشمن پہلی باڑ کے ساتھ بھاگ اٹھا۔ ہم نے ان کا تعاقب کیا۔ وہ ایک گاؤں جھامرہ میں جمع تھے۔ جہاں ہم نے سات سو مویشی قبضہ میں کئے اور جھامرہ کو نذر آتش کر دیا۔ دوسرے روز قابل وثوق ذرائع سے اطلاع ملی کہ احمد خان اپنے ساتھیوں سمیت (موضع)

"اکبر کے" کے قریب موجود ہے۔ کیپٹن بلیک اپنے ایک سو پچاس سواروں کے ساتھ لیفٹیننٹ جی چسٹر کے دستوں کے ساتھ شامل ہو گیا۔ جہاں باغیوں کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ رسالدار مارا گیا۔ کئی گھوڑ سوار گر پڑے اور گھمسان میں کافی نقصان پہنچا۔ جو لوگ یہاں بچے انہیں بھاگنے میں کافی مشکلات پیش آئیں اور اس مہم میں احمد خان کھرل' اس کا بھتیجا مراد اور سردار سارنگ بھی شامل تھا۔

ملتان کے ساتھ خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہے' جس میں ولی داد مردانہ حائل تھا۔

مسٹر برکلے کو کوڑے شاہ روانہ کیا گیا لیکن وہ رابطہ پیدا نہ کر سکا۔ باغی اپنے قبائلی سرداروں' بہاول' سجاول اور ولی داد کی قیادت میں جمع تھے۔ برکلے کو مقابلے میں تھوڑی سی کامیابی ہوئی۔ وہ دوسرے روز احتیاط کے بغیر جنگل میں داخل ہو گیا۔ جہاں باغیوں نے حملہ کر دیا۔ اس کے سپاہی منتشر ہو گئے۔ برکلے کے بازو میں گولی لگی۔ اس نے اپنی تلوار سے حفاظت کی کوشش کی لیکن مراد فتیانہ کے نیزے کا وار مہلک ثابت ہوا۔"[۱۸]

ساہیوال کی بغاوت--- داستانیں اور گیت

تاریخ نے آزادی کے مجاہدوں اور انگریز کے ساتھیوں کے نام الگ الگ خانوں میں بانٹ دیئے ہیں۔ پنجاب میں ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مجاہدین میں سب سے اونچا نام رائے احمد خان کھرل کا ہے۔ دوسرے مجاہدین میں سارنگ' مراد فتیانہ' امانت علی چشتی نظامی' حضرت بابا نگاہی شاہ چنیوٹی' ولی داد مردانہ' سوجا بھدرو' جلا ترہانہ اور موکھا ویہنی وال[۱۹] کے نام نمایاں ہیں۔ اسی طرح انگریزوں کے ساتھی مسلمانوں میں سرفراز خان کھرل' صادق محمد خان' مراد شاہ' مخدوم شاہ محمود' پاکپتن کے مخدوموں' ماچھیا نگڑیال' بہاول نگڑیال' جیوے خان' مراد' سردار شاہ اور گلاب علی چشتی[۲۰] کے نام تاریخ نے محفوظ کر لئے ہیں۔ اسی طرح انگریزوں کے ہندو اور سکھ ساتھیوں میں دھاڑا

سنگھ، نہال سنگھ، ڈانگی سنگھ، کھیم سنگھ، سمپورن سنگھ بیدی، کنہیا رام اروڑہ، ماچھی سنگھ اروڑہ اور جماعت سنگھ کھتری[۲۱] کے نام یاد رکھے جائیں گے۔ اس کے ساتھ تاریخ کی ستم ظریفی یہ ہے کہ اسسٹنٹ کمشنر برکلے کی قبر توگوگیرہ میں موجود ہے لیکن فیصل آباد اور ساہیوال کے شہیدوں میں سے اکثر کی نہ قبریں رہی ہیں اور نہ ان کی یاد میں کوئی مینار تعمیر کیا گیا ہے۔ صرف ساہیوال میں ایک چھوٹی سی یادگار بنائی گئی ہے۔[۲۲]

سیکڑوں مقامی داستانوں اور گیتوں میں ان مجاہدین کے گرد عقیدت کا جال بن رکھا ہے۔ بعض مقامی روایات کے مطابق یہ جنگ محض راجپوتی غیرت کا سوال تھی۔ انگریزوں نے احمد خان کھرل سے اس کی گھوڑی مانگی تھی۔ اس نے انکار کیا۔ جس کے نتیجے میں مہینوں تک جنگ ہوتی رہی۔

موچی والا (جھنگ) کے ایک ڈھولئی ماہمند (محمد) ولد امیر نور محرمی بلوچ کے لفظوں میں برکلے آیا اور اس نے احمد خان سے گھوڑی مانگی۔ احمد نے انکار کیا۔ برکلے نے کہا میں تجھے مروا دوں گا اور لندن سے فوج منگوا کر تیرے وقار کا خاتمہ کر دوں گا اور اگر تو گھوڑی دے دے تو لندن سے تجھے سند منگوا دوں گا۔ احمد خان کے پاس مورنی ذات کی خوبصورت گھوڑی تھی۔ برکلے نے پولیس منگوا کر احمد کے گاؤں جھامرہ ترومنڈی تاندلیانوالہ کو لوٹ لیا۔ اس وقت احمد گاؤں میں نہ تھا۔

بار کے علاقے میں احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں کے بارے میں اسی طرح کی کہانیاں مشہور ہیں۔ ڈھولوں میں بھی کم و بیش یہی خیالات ملتے ہیں لیکن تاریخ ہمیں اس سے مختلف کہانی سناتی ہے۔ یہ بغاوت ایک شخص کے ذاتی وقار کا مسئلہ ہرگز نہ تھی۔ نہ ہی یہ کسی ایک شخص کی خواہش پر شروع ہوئی تھی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ کا آغاز انگریزوں کو لگن دینے سے انکار پر ہوا۔ واقعات کے مطابق موضع سکھوکا (تحصیل پاک پتن) کے جوئیا قبیلے نے انگریزی حکومت کو لگان ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ۸ جولائی کا واقعہ ہے۔ حکومت اس معاملہ کو دبانے میں کامیاب

ہو گئی۔ اسی مہینے کی ۲۶ تاریخ کو احمد خان کھرل اور اس کے ساتھیوں نے ضلع کے صدر مقام گوگیرہ کی جیل پر حملہ کر کے تمام قیدیوں کو رہا کرا لیا۔ احمد خان انگریزوں کی نگرانی کے باوجود خفیہ طور پر بغاوت کی تیاریاں کر رہا تھا اور گوگیرہ جیل پر حملہ اسی سلسلے کی ایک کڑی تھا۔ جیل کے تصادم میں انگریزی سپاہ اور مقامی قیدیوں کے پچاس سے زائد آدمی مارے گئے۔ حکومت قیدیوں کی رہائی سے زیادہ احمد خان کھرل کی روپوشی سے خوفزدہ تھی۔ اس کی گوریلا کارروائیاں حاکموں کے گرد گھیرا تنگ کرتی جا رہی تھیں۔ جب حکومت احمد خان کھرل کی سرگرمیوں کو روکنے اور اسے گرفتار کرنے میں پوری طرح ناکام ہو گئی تو اس نے ایک چال چلی۔ تمام مقامی سرداروں کو بلا کر سرزنش کر دی گئی کہ وہ ضلع کے صدر مقام تک محدود رہیں اور اگر کہیں بہت ضروری جانا پڑے تو حکام کی اجازت لے کر جائیں۔ اس چال سے حکومت کا مقصد یہ تھا کہ احمد خان کھرل کے ساتھیوں کی سرگرمیاں ایک جگہ تک محدود ہو جائیں۔ چنانچہ وہ مجبور ہو کر گوگیرہ (ضلعی صدر مقام) اپنے ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنے آئے گا اور گھیر کر مار لیا جائے گا۔ ان اقدامات کے ساتھ حکومت فوج کی تعداد میں بھی برابر اضافہ کرتی رہی۔

مگر حکومت کی یہ چال ناکام ہو گئی۔ احمد خان کھرل کو گرفتار نہ کیا جا سکا اور سرگرمیوں کا دائرہ پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا۔ حکومت نے اب دوسری چال چلی اور دریائے راوی کے تمام سرداروں کو پیغام بھیجا کہ وہ ۱۷ ستمبر کو کمالیہ میں حکومت سے مذاکرات کریں۔ ان مذاکرات کے ذریعے حکومت ان سرداروں کو خریدنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ ۱۶ ستمبر کی رات احمد خان کھرل نے فرداً فرداً تمام سرداروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں مجبور کیا کہ وہ حکومت کے ساتھ مذاکرات کا بائیکاٹ کریں۔ چنانچہ بیشتر سردار اسی رات کمالیہ سے نکل کر اپنے اپنے علاقوں میں پہنچ گئے اور جنگی جھوں کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔[۲۳]

سرفراز کھرل، جس نے پہلے ۱۸۳۱ء میں لیفٹیننٹ برنس کو لاہور کے سفر کے دوران کافی مدد

دی تھی اور جو سکھوں کی دوسری لڑائی میں انگریزوں کی طرف سے لڑا تھا' اب پھر اپنے پرانے آقاؤں کا کتا بن کر سامنے آ گیا۔ اس نے ڈپٹی کمشنر کو سارے واقعات سے آگاہ کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر نے فوری طور پر بغاوت کو روکنے کے سلسلے میں چند اقدامات کئے۔ ملتان ڈویژن کے کمشنر اور ہڑپہ تحصیل کے افسروں کو متوقع حالات سے خبردار کیا اور بیس سواروں کے ساتھ برکلے کو احمد کھرل کی گرفتاری کے لئے روانہ کر دیا لیکن وہ احمد خان کھرل کو گرفتار کرنے کی حسرت دل میں لئے واپس گوگیرہ پہنچ گیا۔ ڈپٹی کمشنر الفنسٹن سرکاری خزانے اور صدر دفتر کو گوگیرہ سے ہڑپہ منتقل کرنے کے بعد برکلے کو ساتھ لے کر احمد خان کھرل کو مارنے نکلا۔ احمد خان اپنے گاؤں جھامرے میں نہیں تھا۔ "منصف حاکموں" (یہ غالب کے لفظ ہیں) نے اپنے دشمن کی غیر موجودگی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے تمام گاؤں کو جلا دیا۔ اس یک طرفہ جنگ میں سات سو جانور اور بیس آدمی انگریزوں کے ہاتھ لگے۔ احمد خان کی طاقت پر یہ ایک کاری ضرب تھی لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری۔ وٹو قبیلے کے سرداروں کو ساتھ ملا کر اس نے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کا منصوبہ بنایا۔ ادھر انگریز لاہور سے دھڑا دھڑ فوج منگوا رہے تھے۔ ادھر' جھامرہ کو آگ لگانے کے بعد برکلے کوڑے شاہ پہنچ چکا تھا۔ وہ ہڑپہ کی حفاظت کے ساتھ ساتھ ملتان سے مواصلاتی رابطے بحال کرنے کی کوششوں میں مصروف بھی تھا۔[۲۴]

احمد خان کافی تیاری کے بعد گوگیرہ پر حملہ کرنے کے ارادے سے چل پڑا تھا۔ برکلے بھی گوگیرہ پہنچ گیا لیکن ناسازگار حالات کے نتیجے میں گوریلا حکمت عملی کو اپناتے ہوئے احمد خان اور اس کے ساتھیوں نے قریبی جنگلوں میں چھپنا مناسب سمجھا۔ جب الفنسٹن کو خبر ملی کہ کھرل اور وٹو' گوگیرے سے چھ میل دور کشکوری کے جنگل میں چھپے ہوئے ہیں تو اس نے انہیں گھیرے میں لینے کا پروگرام بنایا لیکن کیپٹن بلیک اور لیفٹیننٹ جی چسٹر کو جنگل میں منہ کی کھانی پڑی اور انہیں بیس انگریزوں کی لاشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ حریت پسندوں کی طرف سے احمد خان اور

سارنگ کھرل لڑتے ہوئے مادر وطن پر قربان ہو گئے۔

احمد خان کی شہادت کے بعد مراد فتیانہ برکلے کے خون کا پیاسا ہو رہا تھا۔ کوڑے شاہ کے قریب ایک بار پھر برکلے اور مجاہدین آزادی کا سامنا ہوا۔ اس جنگ میں برکلے اور اس کے پچاس آدمی مارے گئے۔ برکلے کی موت کی تفصیل ماچھی والا کا ماہمند ڈھولئی اس طرح بیان کرتا ہے:

"مراد' برکلے کے سامنے آیا اور مراد کے حامی' انگریز کی یونٹوں سے لڑنے لگے۔ مراد کے پاس اس وقت سانگ (نیزہ بازی کا ہتھیار) اور برکلے کے پاس تلوار تھی۔ مراد نے سانگ ماری اور برکلے چالاکی کے ساتھ اچھل پڑا اور سانگ گھوڑے کی زین کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لڑائی کے دوران برکلے نے سانگ کا اگلا سرا پکڑ لیا اور اسے آہستہ آہستہ اپنی طرف کھینچتا رہا تاکہ مراد قریب آ کر مارا جا سکے۔ اچانک ایک چرواہے سوجے بھادروں نے یہ دیکھا تو اس نے سوچا کہ اس طرح تو مراد مارا جائے گا۔ وہ بھیڑیں چھوڑ کر ادھر کو بھاگا۔ اس کے پاس صرف ایک لاٹھی تھی۔ اس نے وہی لاٹھی پورے زور سے برکلے کے سر پر دے ماری۔ اسے گھوڑے سے نیچے گرا دیا اور مراد کی سانگ نے اسے ہمیشہ کی نیند سلا دیا۔

یاد رہے کہ انگریزی رپورٹ میں یہ کہا گیا تھا کہ برکلے کے بازو میں گولی لگی جس سے وہ گر پڑا تھا اور مراد کی سانگ کا نشانہ بن گیا تھا۔

مراد فتیانہ' احمد کھرل کی موت کا انتقام لینے کے بعد روپوش ہو گیا۔ انگریزوں کے لئے برکلے کی موت ناقابل برداشت تھی۔ انہوں نے جھنگ سے بہاولپور تک لاشوں کے انبار لگا دیئے۔ مراد کو گرفتار کرنے کے لئے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ حکومت نے اس کی جائیداد ضبط کر لی۔ اس کی اولاد کو جیل میں بند کر دیا' لیکن اس کے بیٹے اور بیٹی نے لاکھوں سختیوں کے باوجود اپنے باپ کا پتہ نہ دیا۔ مراد فتیانہ بہت مدت تک ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد پشاور کے راستے افغانستان چلا گیا۔ مراد کی بیٹی حاملہ تھی۔ جیل میں ہی اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا۔ مراد فتیانہ کا بیٹا اور بیٹی جیل میں

ہے اور یوں عوام کا ورثہ واپس عوام کو منتقل کر دیا ہے۔ ہڑپہ کے اے ڈی اعجاز کا کام اس سلسلے میں سب سے نمایاں ہے جنہوں نے احمد خان کھرل اور ان کے ساتھیوں کے حوالے سے ڈھولوں کی کئی کتابیں مرتب کی ہیں۔ یہ ڈھولے ۱۸۵۷ء کے حوالے سے تاریخی مواد کا کتنا بڑا سرمایہ ہیں۔ اس بات کا اندازہ ذیل کے چند ڈھولوں سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دوران انگریزوں نے جب بارہی کے ایک سورما احمد خان کھرل سے تعاون کرنے کی درخواست کی تو اس نے جواب میں کہا تھا

رائے احمد خاں کھرل آہندا اے

رناں، گھوڑیاں تے زمیاں اساں کدی نہ ونڈ تے دتیاں

ہوندیاں بت وچ ساہ سلامت

احمد کھرل کے بارے میں بہت سے گیت لکھے گئے ہیں۔ ان میں اس کی بغاوت پر پنجابی قوم کے فخر اور اس کی شہادت پر اظہار افسوس کا بڑے جوش اور جذبے کے ساتھ بیان کیا گیا ہے ایک وار (رزمیہ نظم) کا مصرعہ ہے۔

ڈھوکاں یاد کریندیاں ہن، اک واری مڑ آویں ہاں

رائے نتھو دیا احمد خاناں

مراد فتیانہ نے لڑائی کے دوران اسسٹنٹ کمشنر برکلے (گیت میں برکلی) کو زخمی کیا۔

"اوہ سر برکلی تے ایویں لتھا، جیویں طامے تے لہندا اے بھکا باز شکاری"

پنجابی گیتوں میں مردانہ کا ذکر بھی کیا گیا ہے جسے کالے پانی کی سزا دی گئی تھی لیکن شاعر کے مطابق وہ بحری جہاز سے چھلانگ لگا کر سمندر میں کود پڑا اور فرار ہو گیا۔ اس کے علاوہ سوجھا بھدرو ہے جس جیسا سورما بہت کم مائیں جنم دیتی ہیں۔ جب برکلے مراد فتیانہ کے بھالے سے زخمی ہو کر گرا تو سوجھے بھدرو نے لاٹھی کے وار سے اسے کیفر کردار کو پہنچایا۔

سوجھے دیاں ڈانگاں دا گھمار انج آوے، جیویں طامے تے لہندی اے باہری

اسی طرح چند اور مثالیں ہیں :

شاموں دھیرے کا آگرے دی جیل توں نٹھا
اوہ گھر پچھدا رائے نتھو دے احمد خان دا
اس وہیا آن سنایا مارے ہندوستان دا

رائے احمد گھل کے ہیرو، کاٹھیے، ویہنی وال، ماہنی سیال
بگھیلے، دلو، کھرل، لیوس کول بلا

انگریز برکلے آہندا ہے : رائے احمد دیویں گھوڑیاں
تیری لندنوں لکھ لیا وساں نیک نامیاں
رائے احمد آہندا ہے : رناں، بھوئیں تے گھوڑیاں
ونڈ کسے نہ دتیاں
ہوندیاں بت دے وچ سماہ سلامی

چڑھدے رائے نوں پرھیں پئیاں ہھکیندیاں،
متھا پیا لیناں ایں نال سرکار دے
ایہناں انگریزاں اگے راجے رنجیت سنگھ نوں تختوں لاہ لیو ای
مولراج رنگے وی دھکے گئے، خزانے لیانیں کھوہ انعام دا

احمد خاں شہید ہویا تاں سر پنجاب دے نوں برطانئے چا گھتیا اے ہتھ

برکلی آکھے : اساں راٹھاں دے دتے مونہہ کڑیالے

اتے کیتی چڑھ سواری

ایہہ گل سن کے گڑھ آلیاں فتیانیاں تھاپی ڈھول تے ماری

تے مڑ نیھوں کڈھ برکلی نوں سٹیوس

جیویں مٹ وچوں لچھا لیندا جھول للاری

یہ داستانیں اور ڈھولے ہمارے اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں کہ پنجابی شاعری' اپنے جوہر میں مزاحمتی شاعری ہی ہے جیسا کہ ہم گذشتہ ابواب میں بھی دیکھ چکے ہیں۔ وہ کلاسیکی شاعری ہو یا لوک شاعری یا پھر عہد حاضر کی شاعرانہ روایات وہ آزادی اور آزاد انسان کی جدوجہد سے خالی نہیں ہو سکتیں۔

حوالے

۱۔ پنجاب اور جنگ آزادی' ہفت روزہ "لیل و نہار"' لاہور' ۱۲ مئی ۱۹۵۷ء' صفحہ ۱۷

۲۔ ایضاً۔

۳۔ ایضاً۔

۴۔ ایضاً۔

۵۔ اقبال اسد' پنجاب دے لچیال پتر' پاکستان پنجابی ادبی بورڈ' لاہور' ۱۹۹۵ء' صفحہ ۲۴

۶۔ ایضاً' صفحہ ۲۵

۷۔ پنجاب اور جنگ آزادی' لیل و نہار..... صفحہ ۱۷

۸۔ ایضاً' صفحہ ۱۹

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً۔

۱۱۔ ایضاً، صفحات ۱۸۔ ۱۹

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۹

۱۳۔ ایضاً۔

۱۴۔ مارکس، ا۔لنگلز، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی، ماسکو، در احمد سلیم، آزادی اور عوام، لاہور، ۱۹۹۰ء، صفحہ ۴۱

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۴۲

۱۶۔ ایضاً، صفحات ۴۲۔۴۳

۱۷۔ ایضاً، صفحات ۴۳۔۴۴

۱۸۔ ایضاً، صفحات ۴۴۔۴۵

۱۹۔ اے ڈی اعجاز، کال بلیندی، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء، صفحات ۲۹۔۴۰

۲۰۔ ایضاً، صفحات ۴۲۔۴۷

۲۱۔ ایضاً، صفحات ۴۸۔۵۱

۲۲۔ شفقت تنویر مرزا، تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء، صفحہ ۵۰

۲۳۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحات ۴۶۔۴۷

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۴۷

۲۵۔ ایضاً، صفحات ۴۷۔۴۸

۲۶۔ ایضاً، صفحات ۴۸۔۴۹

چوتھا باب

غلامی کی نصف صدی اور پنجابی مزاحمت

(۱۸۵۷ـ۱۹۰۰ء)

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد تحریک آزادی کو جو دھچکا پہنچا' اس سے سنبھلنے میں کم از کم نصف صدی کا عرصہ لگا اور ۷ـ۱۹۰۶ء کی بار کی کسان بغاوت سے پنجابی مزاحمت کا ایک نیا اور طویل دور شروع ہوا جو ۱۹۴۷ء میں حصول آزادی پر جا کر منتج ہوا۔ تاہم انیسویں صدی کے نصف آخر میں دو دلچسپ ہتھیار بند تحریکیں برطانوی اقتدار کے لئے بڑا خطرہ بن کر سامنے آئیں۔ ایک تحریک سید احمد شہید دہلوی کے جہادی ورثے کا تسلسل تھی جس میں پنجاب کے مسلمان بھی شریک ہو گئے تھے جبکہ دوسری تحریک سکھوں کے نامدھاری فرقہ کی اصلاحی تحریک تھی جو نہ صرف برطانوی حکومت بلکہ مقامی مذہبی اجارہ داروں کے لئے بھی ایک خطرہ بن گئی۔ یہ اصلاحی تحریک جلد ہی مسلح جدوجہد میں بدل گئی۔

ان دو تحریکوں کے علاوہ مسلمانوں' ہندوؤں اور سکھوں کی کئی اصلاحی تحریکیں بھی سامنے آئیں۔ متعدد اصلاحی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا۔ پنجاب کے مسلمانوں کی درجنوں تنظیمیں وجود میں آئیں۔ اسی دوران انگریزوں نے پنجاب میں مسلمان' ہندو اور سکھ اشرافیہ میں اپنے اتحادی تلاش کئے اور جاگیرداری کا وہ نظام ترتیب دیا جو آج بھی دو سو خاندانوں کی حکمرانی کا باعث ہے۔ یہی دور فرقہ وارانہ تناؤ کا دور بھی ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں' سکھوں اور مسلمانوں اور ہندوؤں اور سکھوں کے درمیان فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہونے لگا۔ اس پس منظر میں دونوں مسلح تحریکیں' ایک دوسری سے الگ تھلگ اور فرقہ وارانہ رنگ میں رنگی دکھائی دیتی ہیں۔

پنجاب میں تحریک جہاد

سید احمد شہید کا جو لشکر جہاد جنوری ۱۸۲۵ء میں دہلی سے روانہ ہوا تھا اور جو ۱۸۲۶ء میں اکوڑہ خٹک کے مقام پر سکھوں سے نبرد آزما ہوا۔ ایک رات کے اس معرکہ میں سکھوں کو بھاری نقصان اٹھا کر پسپا ہونا پڑا۔ اس اثناء میں مجاہدین کی مدد کے لئے پنجاب کے مسلمانوں، خصوصاً راولپنڈی کے گکھڑوں میں زبردست تحریک پیدا ہوئی۔ ان کا ایک دستہ جہاد کی غرض سے اکوڑہ خٹک پہنچا۔

گکھڑوں کے علاوہ پوٹھوہار کے نامور درویش کامل حضرت حافظ محمد عبداللہ دیوان حضوریؒ .شنذوری کی اولاد اور بے شمار متوسلین نے بھی "تحریک مجاہدین" میں بھرپور حصہ لیا۔ تحریک کی ناکامی کے بعد راجہ رنجیت سنگھ خود رہتاس آیا اور "بشن دور" پر باضابطہ حملہ کا پروگرام بنایا مگر ارادہ کو عملی جامہ پہنائے بغیر واپس چلا گیا تاہم درگاہ بشن دور کے متوسلین اور صاحب سجادہ کے افراد خاندان کو "شرکت جہاد" کے بعد بڑی جانکاہ مصیبتیں جھیلنی پڑیں۔ سکھ جرنیل ہری سنگھ نلوہ نے پکڑ دھکڑ کا بازار گرم کیا اور بشن دور کے خاندان عالیہ کے دو بزرگوں کو پکڑ کر رہتاس کے قلعہ میں لے گیا جہاں سہیل گیٹ کے اندر انہیں شہید کر دیا ان کے جنازوں کو اندر کوٹ لے جا کر بے گوروکفن سپرد خاک کر دیا۔ ان کے عزیز و اقارب پر طرح طرح کے ستم ڈھائے ان کے گھر لوٹ لئے اور آستانہ عالیہ بشن دور کا مایہ ناز کتب خانہ تباہ کر دیا۔[1] ۱۸۳۱ء میں مجاہدین کی بالاکوٹ کے مقام پر شکست کے بعد یہ تحریک "ستھانہ" کے مقام پر منتقل ہو گئی۔

۱۸۶۲ء سے ۱۸۷۲ء کے درمیان تحریک مجاہدین کے امدادی مرکزوں سے وابستہ افراد کو انگریزوں نے سیاسی مقدموں میں لپیٹ لیا اور بہت سے جاگیرداروں اور امین داروں کی جائیدادیں بحق مملکت ضبط کر لیں۔ ہندوستان بھر میں تحریک سے دلچسپی رکھنے والوں پر کڑی نگرانی شروع ہو گئی۔ ادنیٰ سے شبہ کی بنا پر قید اور جرمانہ ہی نہیں۔ پھانسی یا عبور دریائے شور کی سزائیں دی جانے لگیں۔ لیکن تحریک کے معاونین بڑی رازداری اور پورے جوش و خروش کے ساتھ اپنا کام کئے جاتے۔ ستھانہ سے مجاہدوں کے نمائندے بھیس بدل بدل کر آتے اور اندرون ملک گھوم پھر کر

اپنے امدادی فنڈ کا روپیہ اور دوسرا ساز و سامان لے کر واپس چلے جاتے۔[۲]

دسمبر ۱۸۶۳ء میں تحریک کے نامور مجاہد مولوی جعفر تھانیسری پر جو مقدمہ چلایا گیا تھا۔ اسی سلسلے میں راولپنڈی سے محمد شفیع اور شیخ الٰہی بخش کو بھی گرفتار کر کے انبالہ لے جایا گیا۔ یہ دونوں متمول ٹھیکیدار تھے جو افواج برطانیہ کو گوشت سپلائی کرنے کا دھندا کرتے تھے۔ مجاہدین کو مالی امداد پہنچانے اور بغاوت کے جرم میں حصہ لینے کی وجہ سے انہیں دھر لیا گیا لیکن ان دونوں نے وعدہ معاف گواہ بن کر جان بچالی۔ جیسا کہ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم نے بھی لکھا ہے۔ ۱۹ ویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں تحریک مجاہدین کا امدادی فنڈ راولپنڈی میں شیخ نبی بخش اینڈ سنز کے پاس جمع ہوا کرتا تھا۔ مولانا ہدایت اللہ مرحوم کے شیخ صاحب سے گہرے دوستانہ مراسم تھے۔ "ستھانہ" سے تحریک کے نمائندے ان ہی کے پاس آتے اور انہی کی وساطت سے اپنا چندہ وصول کیا کرتے تھے۔[۳]

اس تحریک کا کوئی شاعرانہ ریکارڈ نہیں ملتا۔ یہ تحریک' اپنے جوہر میں اس طرح سے عوامی تحریک تھی بھی نہیں جیسی تحریکوں کا احوال ہم گذشتہ ابواب میں بیان کر چکے ہیں۔

نامدھاری یا کوکا تحریک

نامدھاری یا کوکا تحریک اپنے مذہبی پس منظر کے باوجود سیاسی اور انقلابی کردار کی حامل تھی۔ اپنے طبقاتی کردار کی وجہ سے اس تحریک نے انگریزوں سے براہ راست تصادم کا راستہ اپنایا۔ انگریزوں نے پنجاب کے بااثر طبقے سے اتحاد کر کے نئے جاگیردارانہ نظام کی شروعات کی تھیں۔ نامدھاری تحریک اس اتحاد کے لئے بڑھتا ہوا خطرہ تھی کیونکہ تحریک کے قائدین بے زمین ہنرمند تھے۔

نامدھاری کوکا تنظیم سکھوں کی مذہبی اصلاح کے لئے قائم کی گئی تھی۔ لیکن جلد ہی اپنے انگریز دشمن تنظیم کی شکل اختیار کی اور اس کا تضاد انگریز حکومت کے ساتھ پیدا ہو گیا۔ اصلاحات کا بنیادی مقصد سکھ مت پر ہندو مت کے بڑھتے ہوئے اثرات کا تدارک یا روک تھام کرنا اور سکھ سرداروں میں دولت کی ریل پیل سے پیدا ہونے والی برائیوں کا خاتمہ کرنا تھا۔ ہندو مذہب کے زیر اثر سکھوں میں بھی دیوی دیوتاؤں کی پرستش اور پنڈتوں پروہتوں کی تقلید

جڑ پکڑ رہی تھی۔ سکھوں کے ایک دوسرے اصلاحی فرقے نرنکاریوں کی طرح نامدھاری بھی خدا یا واہگورو کا مادی وجود تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اس طرح ان کا مذہبی تشخص ہندوؤں سے مختلف تھا۔ یہ نامدھاری اس لئے کہلواتے تھے کہ وہ صرف گرو کی تعلیم کی پیروی کو ہی کافی سمجھتے تھے۔ کوکا نام سے اس لئے مشہور ہوئے کہ وہ مسلمان درویشوں کی طرح سر جوڑ کر گرو کا ذکر اس طرح کرتے تھے کہ مخصوص آواز نکلتی سنائی دیتی تھی۔ ایسی آواز کو پنجابی میں "کوک" کہتے ہیں۔[۴]

نامدھاریوں کا بانی حضرو ضلع اٹک کا باشندہ بالک سنگھ (۱۸۶۲-۱۷۹۷) تھا۔ لیکن اس فرقے کی نشوونما اور پھیلاؤ ایک دوسرے قائد بابا رام سنگھ کے زمانے میں (۱۸۸۵-۱۸۱۶) ہوئے۔ رام سنگھ مشرقی پنجاب کے ضلع لدھیانہ کے گاؤں بھینی ارائیاں (آج کا "بھینی صاحب") کا رہنے والا تھا۔ بالک سنگھ اور رام سنگھ دونوں طبقاتی لحاظ سے بے زمین دیہاتی تھے۔ جبکہ سکھوں کا بڑا حصہ جاٹوں یعنی زمین کے مالکوں پر مشتمل تھا۔ بالک سنگھ کا باپ سنار تھا اور رام سنگھ ترکھان تھا۔ ان کے پیروکاروں کی بڑی تعداد دستکاروں اور بے زمین کسانوں پر مشتمل تھی۔ رام سنگھ ۱۸۳۶ء سے ۱۸۴۵ء تک مہاراجہ رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل رہا تھا۔ فوجی ملازمت سے مدکی کی جنگ کے بعد سبکدوش ہو کر درویشی کا مسلک اپنایا۔ فوجی ملازمت کے دوران جب وہ حضرو میں متعین تھا اس کی ملاقات بالک سنگھ سے ہوئی۔ بالک سنگھ کے انتقال کے بعد اس نے نامدھاری فرقے کا ہیڈ کوارٹر حضرو سے بھینی صاحب منتقل کر دیا۔

رام سنگھ کی تعلیم مندرجہ ذیل چار احکامات پر مشتمل تھی۔

۱۔ ذاتی اصلاحات کے ضمن میں گوشت خوری اور شراب نوشی پر پابندی تھی۔ دوسروں کی املاک پر قبضہ کرنے، کسی کی بہن بیٹی کو بری نظروں سے دیکھنا منع تھا۔ جھوٹ بولنے اور قرض پر سود لینے کی ممانعت کر دی گئی۔

۲۔ سماجی اصلاحات میں بیٹیوں کو فروخت کرنے اور قتل کرنے پر پابندی لگا دی گئی۔ بیوہ عورتوں کی دوبارہ شادی کا حق تسلیم کیا گیا۔ کیونکہ ہندو مذہب کے زیر اثر سکھوں میں بھی بیوہ کو عقد ثانی کی اجازت نہیں تھی۔ سولہ برس سے کم عمر بچوں کی شادی پر اور وٹے سٹے (یعنی بدلے) کی شادی پر پابندی تھی۔ بیاہ شادیوں پر زیادہ روپیہ خرچ کرنے کی ممانعت کر دی گئی۔

۳۔ مذہبی اصلاحات کے ضمن میں علی الصبح بیدار ہونے، غسل کرنے اور پھر سفید اون کی بٹی ہوئی تسبیح پر ۱۰۸ مرتبہ جاپ کرنے کا حکم دیا گیا۔ عام سکھ پگڑی کے دونوں سرے ماتھے پر ترچھے انداز میں آتے ہیں جبکہ کوکا فرقے کے سکھوں کو گول پگڑی باندھنے اور سفید رنگ کا سادا لباس پہننے کا حکم دیا گیا۔ گائے اور دوسرے مویشیوں کی حفاظت کرنے کا بھی حکم دیا گیا۔

۴۔ سیاسی اصلاحات کے ضمن میں سرکاری محکموں کی ملازمت اختیار کرنے، ڈاک کے ذریعے خط بھیجنے اور بچوں کو سرکاری سکول میں داخل کرنے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ قانونی فیصلوں کے لئے سرکاری عدالتوں کی بجائے پنچائتوں میں فیصلہ کرنے کا حکم دیا گیا۔ غیر ملکی اشیاء کے استعمال پر پابندی عائد کر دی گئی۔ خطوں کی ترسیل کے لئے محکمہ ڈاک کی بجائے اپنا نظام ترتیب دیا گیا۔ دور یا نزدیک کے علاقوں اور دیہات تک پیغام رسانی کے لئے تمام خطوط ایک گھڑ سوار ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں پہنچاتا اور دوسرا گھڑ سوار انہیں اگلے گاؤں لے جاتا۔ فوجی ٹریننگ لازمی قرار دی گئی اور صرف دیسی راجاؤں کی فوجی ملازمت کی اجازت دی گئی۔ سیاسی معاملات سے متعلق ایسے احکامات انگریزوں میں شکوک پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔[۵]

رام سنگھ نے کوکا تحریک کے پروپیگنڈے کے لئے جو افراد مقرر کئے انہیں بھی جو نام دیا اس سے سیاست کی بو آتی تھی۔ یہ لوگ "صوبے" یعنی گورنر کہلاتے تھے ان ساری باتوں نے انگریزوں کو چوکنا کر دیا اور وہ کوکوں سے بدکنے لگے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد انگریز ہر اس اجتماع سے چوکنے ہو جاتے تھے جس میں سیاسی جھلک نظر آتی ہو۔ انہوں نے جلد کوکا تحریک کا نوٹس لیا۔ سب سے پہلے حضرو میں نامدھاری آشرم کی تلاشی لی گئی۔ ۱۸۶۳ء میں بھینی صاحب میں پولیس چوکی قائم کر دی گئی۔ رام سنگھ اور اس کے "صوبوں" پر بھینی صاحب سے باہر جانے پر پابندی لگا دی جو تین برس تک لاگو رہی۔[۶]

انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کرتے وقت سکھوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان کے مذہبی رسم و رواج کا احترام کیا جائے گا اور ان کی دل شکنی نہیں کی جائے گی۔ لکڑی کی ایک تختی پر لکھا ہوا سر جان لارنس کا یہ عہد ۱۹۲۲ء تک دربار صاحب امرتسر کے باہر آویزاں رہا۔ لیکن قبضہ کے کچھ عرصہ بعد ہی اسے فراموش کر دیا گیا۔ انگریزوں کے قبضے کے

بعد امرتسر کے لاہوری دروازے کے باہر جو سیدھا دربار صاحب کو جاتا تھا بوچڑ خانہ (گائے بھینس ذبح کرنے والی جگہ) بنا دیا گیا۔ اسے تعمیر کرتے وقت سکھوں کے مذہبی جذبات کے مجروح ہونے کی قطعی پرواہ نہ کی گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی حوالے سے قائم غیر ملکی لٹیروں کے خلاف تحریک غلط راہ پر چل دی۔ کوکوں نے بوچڑ خانے کو اپنے مذہب کی بے حرمتی تصور کیا اور جھگڑے کی ابتدا کر دی۔ ۱۸۷۱ء میں کوکوں نے اس پر حملہ کر کے چار بوچڑوں (قصابوں) کو ہلاک اور بہت سوں کو زخمی کر دیا۔ رائے کوٹ لدھیانہ میں بھی یہی المیہ دہرایا گیا۔ یہاں تین بوچڑ ہلاک اور تیرہ زخمی ہوئے۔ یہ تمام حملے رام سنگھ کی اجازت کے بغیر کئے گئے۔ رام سنگھ نے ان کی مذمت کی کیونکہ یہ کام اس کے سیاسی عزائم کے خلاف تھا۔ انگریزوں نے ان حملوں کو بہانہ بنا کر کوکوں کو گرفتار کر کے پھانسی پر لٹکانا شروع کر دیا۔ مالیر کوتلے کے نواب کی فوج کے ساتھ کوکوں کا مقابلہ بھی بوچڑوں کی وجہ سے ہوا۔ اس لڑائی کے بعد پچاس کوکوں کو انگریزوں نے توپوں کے دھانے سے باندھ کر ان کے پرخچے اڑا دیئے۔ سولہ کوکوں کو پھانسی کی سزا دی گئی۔ گورو رام سنگھ کو گرفتار کر کے رنگون جلاوطن کر دیا گیا جہاں ۱۸۸۵ء میں وہ انتقال کر گئے۔[۷]

اس تحریک کے دوران شاعروں نے قومی بیداری، آزادی کی تڑپ اور انگریز دشمنی کو موضوع بنا کر کئی نظمیں لکھیں جنہیں بجق سرکار ضبط کیا جاتا رہا۔ چندا سنگھ نامی شاعر کا "بارہ ماہ" اس سلسلے میں خاصا مشہور ہوا۔

گورے بہہ بہہ کرن صلاحین
ایہہ سکھ ساتھوں ڈردے ناہیں
جیہڑے ہو مستانے جاہیں
کوکاں مارن وچ چوراہیں[۸]

چندا سنگھ انگریزوں کو ملیچھ (ناپاک) کہتا ہے:

ایہہ ملیچھ لندنوں آئے
ایہناں بچڑ خانے لائے
سانوں دکھ گئواں دا کھائے

سنگھو! سیس دینے آئے

نام کرتار دے.....[9]

کوکا بغاوت میں اس قدر شدت تھی اور انگریزوں کے دل میں اس کا اتنا خوف بیٹھ گیا تھا کہ کوکا شاعروں کی نظموں میں فرنگی ہر وقت بھاگتے دکھائے گئے ہیں:

بھجے جاندے نی فرنگی

ہن کیہ ویکھنے

دن تاں رہ گئے تھوڑے

وجن گھنگھرو۔[10]

کوکا تحریک کا مجموعی جذبہ انگریز دشمنی کی بنیاد سے عبارت تھا۔ ایک لوک گیت کے بول ہیں:

کوکیاں دا پنتھ نرالا

ہتھاں دے وچ گڑوا رکھدے

گل وچ اٹھ دی مالا

انگریزاں دی این نہ مندے

منگیاں دین نہ ہالا

راج فرنگی دا

چند روز دا چالا

اساں ہند وچ غدر مچاونا

کڈھنا فرنگیاں نوں[11]

مڑھی پرستی، پیر پرستی اور دوسری سماجی برائیوں کی مخالفت کوکا تحریک کا اہم وصف تھا۔ اس کا اظہار وار کے ان

دو مصرعوں سے ہوتا ہے۔

مڑھی سمانی ڈھاہ کے کر دیو میدانا
پہلاں پاندا پیر' فیر مارو سلطانا[2] [1]

"سکھ گردی" یا "سکھا شاہی" کی اصطلاح ہمارے یہاں خاصی مشہور ہے۔ یہ ایک سیاسی اور سماجی بدی کے اظہار کے طور پر استعمال کی جاتی رہی ہے۔ ایک کوکا شاعر سکھا شاہی کا بنیادی سبب سماجی ناانصافیوں کو قرار دیتا ہے

بے انصافیاں کرن سردار لگے
سکھا شاہی تدوں مشہور ہوئی

انیسویں صدی میں سرکاری نوکری کو حرام قرار دینے کا آغاز کوکا تحریک نے کیا تھا۔ یہ گاندھی جی کی تحریک سے نصف صدی پہلے کی بات تھی:

بھانویں ملن حکومتاں' بڑے عہدے
کرنی نوکری وچ سرکار ناہیں
لیرا[3] نہ بدیسی کدے بھل پاونا
رنگی بنھنی کدے دستار ناہیں[4] [1]

اور کوکا باغیوں کو توپ دم کرنے کے لئے زنجیروں میں جکڑ کر توپوں کے سامنے لے جایا جا رہا تھا تو شاعر نے ان کے جذبہ شہادت کو سراہتے ہوئے لکھا:

خوشی نال شہیدیاں پاون خاطر
جتھا چلیا تیز رفتار ہو کے
دھری سورے ترے ہرنام سنگھا!
موہرے اک توں اک دلدار ہوئے[15]

پٹ انگریزی تھانے

مذکورہ بالا دونوں تحریکیں اپنے کردار کے اعتبار سے فرقہ وارانہ تھیں جس کا اثر اس عہد کی شاعری پر بھی پڑا جو پنجابی شاعری کی غیر فرقہ وارانہ اور رواداری پر مبنی روایات کے منافی تھی۔ اس دور کے اہم شعرا میں' مولوی غلام رسول' میاں محمد بخش' خواجہ غلام فرید اور بعض دوسرے شامل تھے جنہوں نے پنجابی شاعری کی روایات سے جڑتے ہوئے اپنے عہد کے بدلے ہوئے منظرنامے پر بھی نظر رکھی اور انہیں یہ دیکھنے اور محسوس کرنے میں دیر نہ لگی کہ "انگریزی راج کی برکتیں" محض ایک افسانہ ہے اور غیرملکی اقتدار پنجاب کی جس ترقی کا ڈھنڈورا پیٹ رہا ہے (فوجی بھرتی' نہروں اور ریلوں کا جال' اسمبلیوں کا قیام) اس سے فائدہ صرف آزاد ہو کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ غلامی کی صورت میں یہ ترقی بدترین قسم کا استحصال بن کر رہ جائے گی۔ اس عہد کا شاعر پنجاب کے مقتدر طبقوں خصوصاً والیان ریاست کو یہ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ انگریز سے اتحاد کر کے نہیں بلکہ اپنی خود مختاری قائم کر کے ہی عوام کی خدمت کی جا سکتی اور ان کے دکھوں کو دور کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تمام رجواڑے (بشمول نوابان بہاولپور) اور بڑے بڑے جاگیردار خاندان' ٹوانے' دولتانے' کھڑ' قریشی' مخدوم' لغاری' کھوسے' الپیال' وٹو' گیلانی اور نون وغیرہ انگریزوں کی کاسہ لیسی اور مزید ایک ڈیڑھ صدی تک اپنے اقتدار کی جڑیں مضبوط کرنے میں مصروف تھے۔ بہاولپور کے نواب ۴۹-۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۹۷ء میں تیراہ کی پشتون بغاوت تک انگریزوں کی مالی' فوجی اور اخلاقی مدد کر رہے تھے۔

پنجابی شاعری میں قصیدے کی روایت نہیں ہے۔ کم ازکم کسی بڑے پنجابی شاعر نے کبھی کوئی قصیدہ نہیں لکھا۔ صرف خواجہ غلام فرید کے ایک قصیدے کا ذکر ملتا ہے جو انہوں نے نواب بہاولپور کی شان میں لکھا تھا۔ اس قصیدے کے ایک شعر کا اکثر ذکر کیا جاتا ہے۔ خواجہ فرید نے نواب کو مشورہ دیتے ہوئے کہا تھا:

اپنے ملک کوں آپ وساتوں

پٹ انگریزی تھانے

یہ مشورہ شاید نواب کے لئے قبول کرنا تو آسان نہ تھا تاہم یہ آواز پنجاب کے عوام تک کئی اطراف میں پہنچ گئی اور صدی کے کروٹ بدلتے ہی وہ اپنی تقدیر بدلنے کے لئے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

حوالے

۱۔ عزیز ملک، پوٹھوہار.....، صفحہ ۸۲

۲۔ ایضاً، صفحہ ۸۳

۳۔ ایضاً، صفحات ۸۳۔۸۴

۴۔ عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملہ آور.....، صفحات ۱۶۰۔۱۶۱

۵۔ ایضاً، صفحات ۱۶۱۔۱۶۲

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۳

۷۔ ایضاً، صفحات ۱۶۳۔۱۶۴

۸۔ پریتم سنگھ کینبو، سوتنتر تا سنگرام دی پنجابی کوتا، کھوج درپن، صفحہ ۹۹

۹۔ ایضاً۔

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۰۰

۱۱۔ پریتم سنگھ کینبو، ضبط شدہ پنجابی کوتا، دلی، ۱۹۹۶ء، صفحہ ۲۲۹

۱۲۔ ایضاً، صفحہ ۲۲۸

۱۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۲

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۴

۱۵۔ ایضاً، صفحہ ۲۳۷

پانچواں باب

''پگڑی سنبھال جٹا'' سے ''غدر گونج'' تک

۱۹۰۷ء میں ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی کو پچاس برس پورے ہو گئے۔ یہ بات چونکا دینے کے لئے کافی تھی کہ غلامی کی نصف صدی اور گزر گئی ہے اور انگریز حکومت ابھی تک وہیں موجود ہے۔ صدی کے آغاز میں ملکہ وکٹوریہ کا انتقال ہو چکا تھا جس کا ہندوستان پر کوئی خاص اثر نہ پڑا کیونکہ نیا بادشاہ بھی اتنا ہی بااختیار یا بے اختیار تھا جتنی ملکہ وکٹوریہ لیکن اس تبدیلی کا ایک نفسیاتی اثر یہ پڑا کہ جس حکمران نے ۱۸۵۷ء میں بہادر شاہ ظفر سے ہمیشہ کے لئے اقتدار چھینا تھا' وہ بھی اب اس دنیا میں نہیں رہی تھی۔

۱۸۹۷ء میں پنجابی لیجسلیٹو کونسل (اسمبلی) کا قیام عمل میں آ چکا تھا اور پنجاب کے معاملات میں اب صوبائی اور مرکزی اسمبلی میں زیر بحث آنا شروع ہو گئے تھے۔ مرکزی اسمبلی پنجاب کے لئے پنجاب انتقال اراضی ایکٹ منظور کر چکی تھی۔ یہ کام ۱۹۰۱ء میں پنجاب کی تقسیم (پنجاب کی حدود میں شامل پشاور' کوہاٹ' ڈیرہ اسماعیل خان' ہزارہ اور بنوں وغیرہ کو الگ کر کے ایک نیا صوبہ--- شمال مغربی سرحدی صوبہ-- کی تشکیل ہوئی) کے فوراً بعد عمل میں آیا۔ پنجاب نے دبے لفظوں اس تقسیم کی مخالفت کی لیکن کوئی بڑا طوفان کھڑا نہ کیا جا سکا۔ لیکن جلد ہی ۱۹۰۵ء میں بنگال کی تقسیم نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ ہندوؤں نے اس انتظامی تقسیم کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ مشرقی بنگال' جو مسلمان آبادی کا حصہ تھا۔ پنجاب کی تقسیم میں مذہب کی بجائے انگریزوں کے انتظامی مفادات شامل تھے۔ بنگال میں بھی معاملہ یہی تھا مگر ہندوؤں نے اسے مذہبی رنگ دے دیا۔ بین الاقوامی سطح پر پوری دنیا میں بھونچال آیا ہوا تھا۔ جاپان کے ہاتھوں روس کی شکست اور ۱۹۰۵ء میں زار کے خلاف روسی

مزدوروں اور کسانوں کی بغاوت ہندوستان پر بھی اثر انداز ہو رہی تھی۔ پنجاب میں پہلے قحط اور پھر طاعون نے لاکھوں زندگیاں نگل لیں۔ بہرحال یہ سیاسی اور سماجی پس منظر تھا جس میں پنجاب ۷-۱۹۰۶ء میں ایک زوردار انگڑائی لے کر غلامی کا جوا اتار پھینکنے کے لئے اٹھ کھڑا ہوا۔

پگڑی سنبھال جٹا

مقامی روایات کے مطابق پنجاب میں "بار" کے نام سے پکارے جانے والے علاقوں میں زمین کے بڑے بڑے ٹکڑے مدتوں سے بنجر پڑے تھے۔ آب پاشی کی سہولتیں نہ ہونے کے باعث یہ ٹکڑے قریب قریب ناقابل کاشت تھے۔ نہروں کی کھدائی کے بعد کسی حد تک آب پاشی کا مسئلہ حل ہوا تو زمینوں کی آبادکاری کا سوال پیدا ہوا۔ ایک وقت یہ تھی کہ جنگل کون صاف کرے۔ ان کاموں کے لئے محنتی کسان ہاتھوں کی ضرورت تھی۔ مرکزی اضلاع کے کسانوں سے کہا گیا کہ وہ ان جنگلوں کو صاف کریں اور بنجر زمینیں آباد کریں۔ انہیں ترغیب دی گئی کہ بہت ہی آسان شرطوں پر ان کو ملکیت کے حقوق دے دیئے جائیں گے۔ کسانوں نے اپنی آباد زمینیں دوسرے ہاتھوں میں سونپ کر نئی زمینوں کی آبادکاری کا کام شروع کر دیا۔ جس لگن اور محنت کی ضرورت تھی اسے بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے ان جنگلوں کو سونے کے وسیع میدانوں میں بدل دیا۔ اب محنت کا پھل سامنے تھا۔ وہ نئی زمینوں کے مالک بننے والے تھے لیکن باری دو آب ایکٹ میں چند ترامیم کے ذریعے مقررہ شرطیں بوجھل بنا دی گئیں۔ نہری پانی کا ٹیکس بڑھا دیا گیا۔ قانون بنا دیا گیا کہ کوئی آبادکار سرکاری اجازت کے بغیر اپنی زمین میں سے درخت نہیں کاٹ سکتا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ زمین کے مالک آبادکار نہیں بلکہ حکومت ہے۔ انگریز چاہتے تھے کہ اس قانون کے ذریعے کسانوں کو کمزور کر کے بڑے بڑے انگریز اور ان کے حاشیہ بردار پنجابی جاگیردار ان زمینوں کے مالک بنا دیئے جائیں اور حقیقی مالکوں کو ان کے تحت مزارعین کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ ان سرکاری اقدامات نے کسانوں کو بھڑکا دیا۔ چناب کالونی اور باری دو آب کے کسان اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ آگ اور بھڑک اٹھی جب ضلع لائل پور کے متاثرین باغیوں میں شامل ہو گئے۔ اس آگ کے شعلے راولپنڈی تک گئے۔ بڑی بڑی کسان ریلیوں کے ذریعے کسانوں نے اپنی

نارا نگیوں کا اظہار کیا۔ صوفی انبا پرشاد' لالہ لاجپت رائے' ضیاء الحق' بانکے دیال' اجیت سنگھ اور سید حیدر رضا اس تحریک کے قائدین میں سے تھے۔[1]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد پنجاب میں جو اہم سماجی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں وہ نہریں بنانے کا نتیجہ تھیں۔ انگریز جانتے تھے کہ اگر پنجاب کے میدانی علاقے میں نہروں کا جال بچھا دیا جائے تو یہاں اتنی گندم پیدا کی جا سکتی ہے کہ پورے ہندوستان کی خوراک کی ضرورت پوری کرنے کے بعد بچائی بھی جا سکے گی۔ اتنی کپاس بھی حاصل ہو سکے گی جس سے برطانیہ کی کپڑے کی ملوں کو سستا خام مال وافر مقدار میں ملے گا۔ لہٰذا ۱۸۴۷ء سے ۱۸۸۵ء تک پنجاب کی غیر آباد زرعی زمین (جسے پنجابی میں بار کہتے ہیں) کے ایک کروڑ دس لاکھ ایکڑ رقبے کو قابل کاشت بنایا گیا۔ اس سے پہلے کل ۷۳ لاکھ ایکڑ رقبہ اراضی پر کاشتکاری کی جاتی تھی۔ پنجاب کی ان نئی زمینوں پر ان مقامات سے کسان لا کے بسائے گئے جہاں آبادی زیادہ اور زمین کم ہو گئی تھی۔ خاص طور پر جالندھر' لدھیانہ' ہوشیارپور اور امرتسر سے کسان لا کر ان علاقوں میں آباد کئے گئے۔ بار کے ان علاقوں میں جو زمین نیلامی کے ذریعے فروخت کی گئی وہاں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے خوشحال کسان بھی آباد ہوئے۔ ان میں سیاستدان اور وکلاء بھی تھے۔ بیوپاری اور ٹھیکیدار بھی۔ غرض یہ کہ جو بھی قیمتاً" زمین خریدنے کی استعداد رکھتا تھا وہ یہاں آباد ہو گیا۔ کچھ اراضی سرکاری گرانٹ یا عطیات کی شکل میں دی گئی۔ یہاں معمولی رقم کے عوض زمینیں حاصل کرنے والوں میں سرکار دربار سے تعلق رکھنے والے سول اور فوج کے اہلکار' انگریزوں کے حمایتی سردار' جاگیردار' ڈاکٹر' انجینئر اور جج وغیرہ شامل تھے اور اس طرح بار کا علاقہ ایک طرح سے "چھوٹا پنجاب" بن گیا جہاں بڑے زمیندار' متوسط کسان اور مزارع چاروں طرف سے آ کے آباد ہو گئے۔[2]

۱۹۰۷ء میں انگریز سرکار نے "پنجاب کا کالونائزیشن بل" اسمبلی میں منظوری کے لئے پیش کیا جس کے خلاف ہر طرف غم و غصے کی فضا پیدا ہو گئی۔ اس بل میں بار کی زمینوں کے آبادکاروں پر مندرجہ ذیل پابندیاں لگانے کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

ا۔ زمین کی تقسیم در تقسیم پر پابندی عائد کرنے کے لئے وراثت کے قانون میں ردوبدل کیا جائے۔ مالک زمین

کے انتقال کے بعد ساری زمین بڑے بیٹے کو منتقل ہو جائے۔

۲۔ زمین کے بیچنے پر پابندی لگائی جائے۔

۳۔ زمین پر اگے ہوئے درخت حکومت کی اجازت کے بغیر کاٹنے کو غیر قانونی قرار دے دیا جائے۔

۴۔ امرتسر، گورداسپور اور لاہور میں کئی مقامات پر آبیانہ کی شرح میں ۵۰ فی صد اضافہ کر دیا جائے۔

اس بل کے اسمبلی میں پیش کئے جانے کے وقت پنجاب کے لوگوں کی معاشی حالت فصلیں خراب ہونے کے باعث بہت خستہ ہو چکی تھی۔ اسمبلی کے ممبروں نے اس بل کی سخت مخالفت کی لیکن حکومت اسے منظور کروانے میں کامیاب ہو گئی۔[۳]

اس بل کے اسمبلی میں پیش کئے جانے سے پہلے ہی سارے پنجاب میں اس پر نکتہ چینی کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سارے پنجاب میں کسانوں کے احتجاجی جلوس نکلنے شروع ہو گئے۔ خاص طور پر رچنا باری دو آب میں اور عمومی طور پر تمام پنجاب میں جو زوردار احتجاج ہوئے وہ یہ تھے۔

۲۱ جنوری ۱۹۰۷ء کو سانگلہ ہل شہر میں تین ہزار کسانوں کا اجتماع ہوا۔ سیاسی لیڈروں اور کارکنوں نے حکومت کے خلاف تقریریں کیں۔ ۳ فروری اور پھر ۲۷ مارچ کو لائل پور (فیصل آباد) میں کسانوں کا اجتماع ہوا اور پھر بڑے بڑے جلوس نکالے گئے۔ ان اجتماعات میں لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ نے جو بھگت سنگھ کا چچا تھا، تقریریں کیں اور جلوسوں کی قیادت کی۔[۴] دیگر نمایاں لوگوں میں شہاب الدین، جنہیں بعد میں سر کا خطاب ملا اور سراج الدین (مولانا ظفر علی خان کے والد) بھی شامل تھے۔

انہی دنوں "پگڑی سنبھال اوئے جٹا" کا گیت فضاؤں میں بلند ہوا جس نے پنجاب بھر میں بغاوت کی آگ روشن کر دی۔ کسانوں کے ساتھ ساتھ شہروں کے پڑھے لکھے نوجوان بھی میدان میں کود پڑے۔ یہ بغاوت جب زور پکڑ گئی تو لائل پور کے قریب کسانوں نے ریل کی پٹڑیاں اکھیڑ پھینکیں۔ دیہات میں بچہ بچہ انقلابی گیت گانے لگا:

پگڑی سنبھال جٹا، پگڑی سنبھال اوئے

لٹ لیا مال تیرا، کیتا بے حال اوئے

انگریزوں کے خلاف نفرت یہاں تک بڑھی کہ انہیں اپنی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی اور مجبور ہو کر انہوں نے بار کے قانون میں اپنی ترامیم واپس لے لیں۔[۵]

بعض روایات کے مطابق یہ نظم سر شہاب الدین نے لکھی تھی۔ اس تحریک میں وہ بے حد پیش پیش تھے اور یہ ان کے سر کا خطاب پانے سے کئی سال پہلے کی بات تھی۔ انہوں نے "مسدس حالی" کا پنجابی ترجمہ بھی کیا۔ اس نظم کے کئی الگ الگ نمونے الگ الگ روایات میں ملتے ہیں اور شہاب الدین کے علاوہ اس نظم کے خالق کے طور پر بعض دوسرے شاعروں کا نام بھی سننے میں آتا ہے۔ سکھ مورخین کے مطابق نظم کا ایک نمونہ کچھ اس طرح بھی ہے :

پگڑی سنبھال جٹا، پگڑی سنبھال اوئے
ہند ہے مندر تیرا، اس دا پجاری او
جھلیں گا اجے کد تک، ہور خواری او
مرنے دی کر لے، ہن چھیتی تیاری او
مرنے توں جینا بھیڑا، ہو کے بے حال اوئے
پگڑی سنبھال جٹا، پگڑی سنبھال اوئے

یہ تحریک جو کالونائزیشن بل کے خلاف شروع ہوئی تھی جلد ہی انگریزوں کے خلاف آزادی کی تحریک بن گئی۔ ہر طرف غیر ملکی حاکموں کے خلاف عوامی نفرت کا اظہار ہونے لگا۔ سی آئی ڈی کی ایک رپورٹ کے مطابق کالونائزیشن ایکٹ کے خلاف تو صرف آٹھ دس جلسوں میں تقریر کی گئی لیکن باقی جلسوں اور جلوسوں میں حکومت دشمن تقریریں ہوتی رہیں۔ اس تحریک کا دائرہ کسانوں تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ ان کے علاوہ وکیلوں، کلرکوں، محنت کشوں اور طلباء تک پھیل گیا۔ جب مارچ ۱۹۰۷ء میں پنجاب کا لیفٹیننٹ گورنر سر چارلس ریواز ریٹائر ہونے سے پہلے امرتسر اپنے آخری دورے پر آیا تو اس کا استقبال کرنے کی بجائے خالصہ کالج کے طلباء نے اس کے خلاف مظاہرہ کیا اور حکومت کے خلاف نعرے لگائے۔[۶]

۱۶ اپریل ۱۹۰۷ء کو لاہور میں اس سیاسی سیلاب کا پہلا ریلا داخل ہوا۔ اس روز ایک ہفت روزہ رسالہ "پنجابی" کے ایڈیٹر کے کے اتھوالے کی چیف کورٹ لاہور (آج کے ہائی کورٹ) میں پیشی تھی۔ ایڈیٹر کا قصور یہ تھا کہ اس میں چھپنے والے دو مضامین میں انگریز حکومت کی مذمت کی گئی تھی۔ ایک مضمون کا عنوان تھا "ایک نازک مسئلہ" جس میں ڈپٹی کمشنر راولپنڈی کے سرکاری دورے کے دوران ان قلیوں کی موت پر تبصرہ تھا جن کے ذمے اس کا سامان اٹھانا تھا۔ ان پر اتنا بوجھ لاد دیا گیا تھا کہ وہ اس کے نیچے دب کر مر گئے تھے۔ دوسرا مضمون پنڈی کے ایک ضلعی افسر کے ہاتھوں شکار کے دوران بے احتیاطی سے ایک پنجابی کے ہلاک ہو جانے کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ اس مضمون کا عنوان تھا "غلط فہمیاں کیسے پیدا ہوتی ہیں۔" ۱۶ اپریل ۱۹۰۷ء کو جب چیف کورٹ میں یہ مقدمہ پیش ہوا تو مقدمے کی کاروائی سننے کیلئے لاہور کے بہت سے شہری اکٹھے ہو گئے۔ ان لوگوں کی ہمدردیاں ایڈیٹر کے ساتھ تھیں۔ انگریز جج نے جب ایڈیٹر کو قید کی سزا سنائی اور پولیس کے کے اتھوالے کو جیل لے جانے کے لئے روانہ ہوئی تو مشتعل ہجوم نے ڈنڈے اٹھا کر پولیس پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے ایڈیٹر اتھوالے کے گلے میں ہار ڈالے۔ لاہور میں ہونے والے اس واقعہ کا سارے ہندوستان میں چرچا ہوا۔ پنجاب سرکار کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔[۷]

راولپنڈی میں ۲۱ اپریل ۱۹۰۷ء کو کالونائزیشن بل کے خلاف ایک احتجاجی مظاہرہ ہوا جس میں اجیت سنگھ نے حکومت پنجاب کے خلاف ایک جوشیلی تقریر کی۔ حکومت نے اس تقریر کو باغیانہ قرار دے کر جلسے کا اہتمام کرنے والوں کو عدالت میں طلب کرنے کے لئے سمن جاری کر دیئے۔ ملزمان کے عدالت میں پیش ہونے سے پہلے ہی ایک بہت بڑا جلوس عدالت کے باہر جمع ہو چکا تھا۔ اتنے بڑے ہجوم کو دیکھ کر ڈپٹی کمشنر نے سماعت ملتوی کر دی۔ لیکن مشتعل ہجوم نے حکومت کے خلاف نعرے لگانے کے علاوہ ڈی سی کے گھر پر حملہ کر دیا اور سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ کی۔ راولپنڈی کے دوسرے احتجاجی اجتماع میں لالہ لاجپت رائے نے خطاب کرنا تھا۔ لالہ لاجپت رائے کانگریس اور آریہ سماج دونوں تنظیموں کے لیڈر تھے۔ حکومت پہلے ہی بدکی ہوئی تھی اس نے اجتماع کو غیر قانونی قرار دے دیا اور اس طرح لاجپت رائے کو تقریر کرنے کا موقعہ نہ ملا۔[۸]

مشتعل ہجوم کے اسی اجتماع میں ایک نوجوان شاعر نے پنجابی کی ایک نظم پڑھی۔ نظم کا ایک شعر تھا:

بھارت واسیو! ستیو غافلو وے

ڈھیری تساں نے کیوں ہے ڈھائی ہوئی[9]

اسی طرح شہاب الدین کی ایک اور نظم "آباد کار دا ہاڑا" بھی بہت مشہور ہوئی۔ اس نظم میں بار آباد کرنے والوں کی جدوجہد اور انگریزوں کی آبادکار مخالف پالیسی کا اظہار کیا گیا۔

جلد ہی یہ تحریک پنجاب کے دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ انہی دنوں گوجرانوالہ سے نکلنے والے ہفت روزہ "انڈیا" کے ایڈیٹر لالہ پنڈی داس نے ہندوستانی فوجیوں کے نام کسی کا خط شائع کر دیا۔ اس خط میں ہندوستانی فوجیوں کو بغاوت پر اکسایا گیا تھا۔ خط میں ہندوستانی سپاہیوں کو ملنے والی تنخواہوں اور دیگر سہولتوں کا انگریز فوجیوں کو ملنے والی تنخواہوں اور سہولتوں سے موازنہ کرتے ہوئے بتایا گیا تھا کہ ایک ہندوستانی سپاہی کو صرف نو روپے ماہوار تنخواہ ملتی ہے جبکہ انگریز سپاہی کو مفت یونیفارم اور کھانے کے علاوہ پندرہ روپے تنخواہ دی جاتی ہے۔ اس ہفت روزہ میں شائع ہونے والے خط کی نقلیں مردان میں متعین فوجیوں سے برآمد ہوئیں۔ لالہ پنڈی داس کو گرفتار کر لیا گیا۔ اسے بغاوت کے جرم میں پانچ سال کی سزا دی گئی' رسالہ کا ڈیکلریشن منسوخ اور پریس ضبط کر لیا گیا۔

انگریزی حکومت کے خلاف یہ تحریک پنجاب کے تمام بڑے شہروں میں چل نکلی' یکم مارچ سے یکم مئی تک راولپنڈی' لاہور' لائل پور' فیروز پور' امرتسر' بٹالہ اور دوسرے بڑے شہروں میں تقریباً ۲۸ اجتماع ہوئے۔ ان میں لالہ لاجپت رائے اور اجیت سنگھ نے ایک ساتھ یا علیحدہ علیحدہ مقررین کے طور پر عوام سے خطاب کیا۔[10]

معاملہ احتجاجی جلسوں اور ان پر ہونے والے تشدد پر ہی نہیں رکا۔ اخبارات نے بھی کھل کر لکھنا شروع کر دیا۔ طرح طرح کی افواہیں پھیلنے لگیں۔ یہ کہا جانے لگا کہ جنگ آزادی کو پچاس سال گزر گئے ہیں اس لئے دوبارہ ایک تحریک شروع ہونے والی ہے جو ۱۸۵۷ء کی طرح ناکامی پر منتج نہیں ہو گی۔ معاملات یہاں تک بگڑے کہ بغاوت کی باتیں ۱۸۵۷ء کی طرح فوجی بیرکوں میں بھی ہونے لگیں۔ یہ حکومت کے لئے ایک لمحہ فکریہ تھا۔ کمانڈر انچیف کچھر برطانوی حکومت کو یہ سفارش کرنے پر مجبور ہو گیا کہ کالونائزیشن ایکٹ ختم کر دیا جائے ورنہ ہندوستانی سپاہی جنگ آزادی برپا کر دیں گے۔

صورت حال یہ تھی کہ محکمہ مال سمیت' مختلف اداروں میں ہڑتالیں شروع ہو گئیں۔ کسانوں نے مالئے کی ادائیگی سے انکار کر دیا۔ پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر ابٹس نے وائسرائے لارڈ منٹو کو لکھا "پنجاب کی صورت حال بہت سنگین ہو گئی ہے یہاں باغیانہ سرگرمیوں کا ہیڈ کوارٹر وجود میں آ گیا ہے۔" ۱۸۱۵ء کے ایک پرانے قانون کے تحت بغاوت کے دو مرکزی رہنماؤں لالہ لاجپت رائے اور سردار اجیت سنگھ کو جلاوطن کر کے مانڈلے بھیج دیا گیا۔ اجیت سنگھ بھگت سنگھ کے چچا تھے۔

پنجاب میں یہ بات کھل کر کہی جانے لگی کہ برطانوی حکومت پنجابی عوام کے ساتھ وہی سلوک کر رہی ہے جو روس کا زار اپنی رعایات سے کرتا ہے اس لئے اب پنجابیوں کو بھی وہی جواب دینا پڑے گا جو روسی عوام زار کو دے رہے ہیں۔ بہرحال جلد ہی حکومت کو اپنا رسوائے زمانہ قانون' جو اس نے رائے عامہ کی مرضی کے خلاف پنجاب کے عوام پر ٹھونسا تھا' منسوخ کرنا پڑا۔

ضبط شدہ چیخیں

کالونائزیشن ایکٹ کے خلاف "پگڑی سنبھال جٹا تحریک" کے نتیجے میں بغاوت کی مہم زور و شور سے شروع ہو گئی۔ انگریزی روزنامہ "پنجابی" اور اردو روزنامہ "زمیندار" نے اس بغاوت کو تیز کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مولانا ظفر علی خان' لالہ پنڈی داس اور لالہ دینا ناتھ جیسے بے خوف صحافیوں کو' ضمانتوں کی ضبطیوں' اپنے اخبارات پر لگنے والی پابندیوں اور قید و بند کی صعوبتوں تک کا سامنا کرنا پڑا۔

بغاوت کا یہ محض ایک رخ تھا۔ اسی دور میں ایسی کتابیں اور کتابچے بھی چھپ کر سامنے آنے لگے جن میں برطانوی غلامی کے خلاف کھلی بغاوت کا پرچار کیا جا رہا تھا۔ حکومت نے ان کتابوں اور کتابچوں کو ضبط کرنا شروع کر دیا۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۹ء کو ایچ جی سٹوکس' ڈپٹی سیکرٹری' حکومت ہند (داخلہ) نے پنجاب کے چیف سیکرٹری کے نام اپنے خط نمبر ۷۷۷ میں اکیس ایسے کتابچوں کی لسٹ ارسال کی اور کہا کہ یہ تمام کتابچے برطانوی حکومت کے خلاف بے چینی پھیلانے کی منظم مہم کا حصہ معلوم ہوتے ہیں اس لئے کیا ان پر دفعہ ۱۲۴ الف (اس کے ساتھ دفعہ ۱۰۷ بھی پڑھی

جائے) کے تحت کیوں نہ سازش کی فرد جرم عائد کی جائے۔"

ان کتابچوں میں صوفی امبا پرشاد کا "باغی مسیح"، اجیت سنگھ کا "محبان وطن"، جسٹس امیر علی کے ایک مضمون کا انگریزی ترجمہ "ٹیپو سلطان"، غلام قادر فصیح کا "روس کی موجودہ حالت"، کیسر سنگھ کا "جاپان کی ترقی"، اجیت سنگھ کا "ہندوستان میں انگریز سرکار نے انگلی پکڑتے ہی کلائی پکڑ لی"، زاریت کا زوال، "قومی ترقی"، سورن سنگھ کا "غدر" اور کئی دوسرے شامل تھے۔[۱۲]

پنجاب کے انقلابی صرف کتابی ہی نہیں تھے۔ انہوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کے لئے لوگوں کو تیار کرنے کا عہد کر رکھا تھا۔ ان کی سرگرمیوں کی اطلاع جب انگریزوں کو ہوئی تو انہیں گرفتار کرنے کے لئے چھاپہ مار مہم شروع کر دی گئی۔ ہوشیار پور بھی ان انقلابیوں کا ایک ٹھکانہ تھا۔ یہاں سے چھاپے کے دوران پولیس کو بہت سا انقلابی لٹریچر ہاتھ لگا۔ ایک ایسے منصوبے کا سراغ بھی ملا جس میں انقلاب کے مختلف مراحل سے عہدہ برآ ہونے کی ترکیبیں درج تھیں۔ اس کے مطابق حکومت دشمن انقلابی جدوجہد کے پہلے مرحلے میں ہندوؤں کو تیار کیا جانا تھا، دوسرے مرحلے میں مسلمانوں کو جدوجہد کی حمایت کے لئے آمادہ کرنا تھا، تیسرے مرحلے میں خزانہ اور ڈاک خانہ لوٹ کر افراتفری پھیلانا تھا۔ اس منصوبہ میں مندرجہ ذیل تین طرح کے نوجوانوں کے لڑاکا گروپ تیار کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا تھا۔ (۱) انتظامی گروپ (۲) دشمن کی مخبری کرنے والے نوجوانوں کا گروپ (۳) مسلح کاروائیاں کرنے والے نوجوانوں کا گروپ۔ تینوں گروپوں کا انتخاب قرعہ اندازی سے کیا جانا تھا۔ مسلح کاروائیوں کا مقصد غداروں، حکومت کے جاسوسوں اور اعلیٰ سرکاری افسروں میں سراسیمگی پیدا کرنا تھا۔[۱۳]

اس تحریک میں کتابوں کی ضبطی، پولیس کے چھاپوں اور ان کتابچوں کے مصنفوں اور ناشروں کی وسیع پیمانے پر گرفتاریاں بھی حالات پر قابو نہ پا سکیں۔ البتہ انقلابیوں کے لئے کھل کر کام کرنا خاصا مشکل ہو گیا۔ جب ملک میں آزادی کی جدوجہد کو جاری رکھنا مشکل ہو گیا تو انہوں نے ہندوستان سے باہر جا کر آزادی کے اس الاؤ کو جلائے رکھنے کا فیصلہ کیا۔ جلد ہی برطانیہ، فرانس، کینیڈا اور امریکہ پنجابی انقلابیوں کی سرگرمیوں کا مرکز بن گئے۔ ایک نوجوان پنجابی مدن لال ڈھینگرہ نے کرزن وائلی کو، جو ہندوستانی طلبا کی سرگرمیوں کی مخبری کرنے والے ادارے کا سربراہ تھا، گولی مار

کر ہلاک کر دیا۔ ڈھینگرہ پر مقدمہ چلا کر موت کی سزا دی گئی۔ عدالت میں اس نے جو بیان دیا وہ آج دنیا بھر کے حریت پسندوں کا پسندیدہ بیان ہے۔

"میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے ہندوستان کے وطن پرستوں کو پھانسی دینے اور ملک بدر کرنے کا تھوڑا سا بدلہ چکانے کے لئے کچھ دن پہلے ایک انگریز کا لہو بہایا ہے۔ اس اقدام کے لئے میں نے اپنے ضمیر کے سوا کسی سے مشورہ نہیں کیا۔ میں نے سازش نہیں کی بلکہ اپنا فرض پورا کیا ہے۔

"میرا یہ عقیدہ ہے کہ جو قوم غیرملکیوں کی سنگینوں کی زد میں ہو وہ مستقل جنگ کی حالت میں ہوتی ہے۔ مجھے یہ اچانک حملہ اس لئے کرنا پڑا کہ ان قوموں کے لئے جن سے ہتھیار چھین لئے جائیں آزادانہ طور پر کھلے بندوں لڑائی جاری رکھنا ناممکن بنا دیا جاتا ہے۔ بندوق رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لئے پستول نکالا اور گولی مار دی۔

"آج ہندوستان کے لوگوں کو صرف ایک سبق یاد کرانے کی ضرورت ہے وہ یہ کہ لڑنا کیسے چاہئے اور سکھانے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے خود موت کو گلے لگانے کی ریت پیدا کی جائے۔ اسی لئے میں نے آج شہادت کی موت کو سینہ سے لگانا پسند کیا ہے۔

"میری خواہش ہے کہ اس دھرتی پر دوبارہ جنم لوں اور پھر اس سچے آدرش کے لئے جان کا نذرانہ پیش کروں یہاں تک کہ آزادی کے حصول کی تمنا پوری ہو جائے اور میری مادر وطن آزاد ہونے کے بعد انسانیت کی بہتری کے لئے اور خدا کی عظمت کے لئے کام سرانجام دے سکے۔ بندے ماترم۔"

مدن لعل ڈھینگرہ کی صورت میں ضبط شدہ چیخوں نے اپنا اظہار پا لیا تھا۔

غدر پارٹی

بیسویں صدی کے آغاز میں بیروزگار پنجابیوں نے محنت مزدوری کے لئے امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا اور جاپان وغیرہ کا رخ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا رخ زیادہ تر کینیڈا اور امریکہ کی طرف تھا۔ بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں' خود امریکہ اور کینیڈا میں مقامی مزدور بیروزگاری کا شکار ہو رہے تھے۔ پنجابی مزدور کم تنخواہوں پر مزدوری کے لئے تیار ہو

جاتے جس کے باعث ان کا مقامی مزدوروں سے تضاد پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ پنجابی محنت کار اب ذلت، تضحیک اور تشدد کا نشانہ بننے لگے۔ انہیں محسوس ہونے لگا کہ ان کی ذلت کی بنیادی وجہ ان کی غلامی ہے چنانچہ انہوں نے سیاسی طور پر منظم ہونے کا فیصلہ کیا۔ پہلے وہ "ہندوستانی ایسوسی ایشن آف پیسفک کوسٹ" کی صورت میں منظم ہوئے۔ اس تنظیم میں منشی کریم بخش سیکرٹری مقرر ہوئے۔ یہی تنظیم بعد میں "غدر پارٹی" کے نام سے مشہور ہوئی۔ سان فرانسسکو سے ہفت روزہ "غدر" جاری کیا گیا۔ اس کی پہلی اشاعت اردو میں تھی۔ جلد ہی یہ پنجابی میں بھی چھپنے لگا اور اس کی مانگ بہت بڑھ گئی۔ رسالے کا اجراء کا مقصد بیان کرتے ہوئے ایک مضمون میں کہا گیا تھا:

"ہماری اس تحریک کا مقصد ہندوستان بھر کے لوگوں کو بغاوت کے لئے تیار کرنا ہے تاکہ انگریز حکومت کو جڑ سے اکھاڑا جا سکے۔ یہ حکومت ایک دیمک خوردہ درخت کی مانند ہے۔ ہم ہندوستان میں قومی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر کو ۵۳ سال بیت چکے ہیں۔ آج ایک نئے غدر کی ضرورت ہے۔ آج ہم انگریز حکومت کے خلاف جنگ کا اعلان کرتے ہیں۔ ہمارا مقصد کیا ہے؟ بغاوت۔ بغاوت کہاں سے شروع ہو گی؟ ہندوستان سے۔ وہ دن قریب آ رہا ہے جب قلم اور سیاہی کی جگہ بندوق اور ہتھیار لے لیں گے۔"

اسی اثناء میں کاما گاٹا مارو جہاز کا سانحہ رونما ہوا۔ اس جہاز میں ہندوستان سے آنے والے ۳۷۶ پنجابی مسافروں کو وینکوور کی بندرگاہ پر اترنے سے روک دیا گیا۔ کئی ماہ تک بھوکے پیاسے مسافروں کو کئی ماہ بعد جہاز کو کلکتہ واپس آنا پڑا۔ غدر پارٹی نے اس مسئلے پر بھرپور سیاسی کام کیا۔ جہاز میں غدر پارٹی کے قائدین بھی بھیس بدل کر سوار ہو گئے۔ کلکتہ میں بھی انہیں ذلت آمیز برتاؤ کا نشانہ بنایا گیا۔ تصادم کے نتیجے میں تین انگریز افسروں سمیت اٹھارہ آدمی ہلاک ہو گئے۔ اب غدر پارٹی نے پنجاب میں کام شروع کر دیا۔ نوجوان انقلابی کرتار سنگھ سرابھا پیش پیش تھا۔ جلد ہی اسے گرفتار کر کے پھانسی دے دی گئی۔ سرابھا، خود بھی پنجابی کا شاعر تھا اس کے یہ شعر بہت مقبول ہوئے:

سیور دیش دی جندڑیئے بڑی اوکھی
گلاں کرنیاں ڈھیر سکھلیاں نیں

جیہناں دیس سیوا وچ پیر پایا

اوہناں لکھ مصیبتاں جھلیاں نیں

بعد ازاں غدر پارٹی نے فوج میں بغاوت کے لئے کام کیا۔ جنوب مشرقی ایشیا میں متعین پنجابی فوج کو بغاوت کے لئے تیار کیا گیا۔ بغاوت کا آغاز سنگاپور سے ہوا۔ پنجاب میں بھی فوجی بغاوت کا پروگرام بنا لیکن مخبری کے باعث بغاوت برپا نہ کی جا سکی۔ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں ہوئیں اور پہلا "لاہور سازش مقدمہ" تیار ہوا۔ انہیں کالے پانی اور پھانسیوں کی سزائیں دی گئیں۔ امریکہ میں بھی غدر پارٹی کے رہنماؤں پر مقدمے چلائے گئے۔

غدر گونج اور پنجابی شاعری

سینہ ایم رائے کے لفظوں میں "غدر پارٹی کوئی بڑی کامیابی حاصل نہیں کر سکی لیکن پنجاب کی سیاست میں ایک نئی روایت قائم کی۔ انہوں نے آزادی کی جدوجہد کے بین الاقوامی کردار پر زور دیا۔ غدر کے سربراہوں نے ہر اس تنظیم اور فرد کے ساتھ مل کر کام کیا جو ان کے آدرش سے ہمدردی رکھتا تھا۔ انہوں نے افغانستان، چین، ترکی، سوئٹزرلینڈ، انگلستان، سویڈن، میکسیکو، آئرلینڈ اور کینیڈا کی تنظیموں اور لوگوں سے مدد حاصل کی۔ غدر باغیوں نے ایک اہم بات یہ بھی کی کہ انقلابی جدوجہد کا مرکز بابر کے ملکوں سے اٹھا کر ہندوستان لے آئے۔ یہ کام انقلابی جدوجہد کو موثر بنانے کے لئے بہت ضروری تھا، بیرون ملک آباد کاروں کے واپس آنے سے پنجاب کے عوام میں سیاسی شعور کا اضافہ ہوا۔"[۱۴۴]

"غدر گونج" میں شائع ہونے والی پنجابی شاعری اس تحریک کا نہایت قیمتی ادبی ورثہ ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جن شاعروں نے یہ نظمیں لکھیں اور وہ "غدر گونج" میں شائع ہوتی رہیں، ان میں سے اکثر کے نام معلوم نہیں ہیں۔ ان شعراء کے نزدیک بنیادی مقصد پیغام پہنچانا تھا، اپنا نام نہیں۔ ان نظموں کو ہم لوک شاعری تو قرار نہیں دے سکتے لیکن اکثر شعراء کے نام معلوم نہ ہونے کے باعث، یہ ایک طرح سے لوک شاعری کا ہی درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ آج "غدر گونج" کے جو شمارے دستیاب ہیں، وہ ہمارا سب سے بنیادی تاریخی ماخذ ہیں۔ یہ

نظمیں، حب الوطنی، بہادری، قربانی اور انسان دوستی کے بنیادی انسانی جذبوں سے بھری ہوئی ہیں۔ اپنی زندگی کو تحریک کے لئے قربان کرنے کا جذبہ غدری شاعروں کا بنیادی جذبہ تھا جیسے کہ مندرجہ ذیل نظم سے ظاہر ہوتا ہے:

جان پیاری کرو نہ شیرو، اک دن نکل جانی اے

اسی نظم میں آگے چل کر شاعر کے بول ہیں:

دنیا وچ نہ جھنڈا ساڈا، اکھیں ساڈی کانی اے
دنیا دے وچ نال اساڈے، ہندی کتے۔ کھانی اے
تن من دھن سبھ وارو جے کر شوق نشان چڑھاون دا
آؤ شیرو غدر مچایئے، موقع نہیں کھنجاون دا[۵]

ایک اور غدری نظم میں جان دینے والے آزادی کی موجوں سے یوں لطف اندوز ہوتے ہیں:

نہیں ظالماں ظلم دی کسر چھڈی
ہوسی نہیں نقصان روال میرا
میری آتما سدا اڈول ویرو!
ویری کر سکو نہ ونگا وال میرا
میرے بت نوں ظالماں قید کیتا
کھلا پھرے آزادی خیال میرا[۶]

غدری شاعر قربانی کے اتھاہ جذبے کا اظہار کر کے کیسے دوسرے غدریوں کو اس جذبے کی طاقت بخشتا ہے:

فوج عشق آزادی دی کر کٹھی
غدری کوچ دا ناد وجا دیاں گے
پیر پیر تے پین مصیبتاں جو
پیریں عشق جرنیل دی پا دیاں گے

روکن راہ جے ستے سمندر آ کے
وانگ تلی دے خشک کرا دیاں گے
جنگل آون پہاڑ دشوار اگے
صفحہ ہستی توں سبھ مٹا دیاں گے[۷]

غدری شاعر، پنجاب کی بہادری کی پرانی روایات کا ذکر کر کے غدری قارئین کو اس طرح متاثر کرتا ہے:

ہندستانی دلاریو! سنو بھائیو!
دلی خیال دی بات سنا دتی
میرے باپ بزرگ دے خون جگرو!
دیسی پریت کیوں ریت بھلا دتی
سوہنی شان والے سی بزرگ ساڈے
عزت اوہناں دی خاک ملا دتی

ایک اور نظم میں یوں اظہار کیا گیا ہے:

ہندستانیو! رکھنا یاد سانوں
کتے دل تو نہیں بھلا جانا
خاطر وطن دی چڑھے ہاں اسیں پھانسی
دیکھ اساں نوں نہیں گھبرا جانا
دیس واسیو! چمکیو چن وانگوں
کتے بدلیاں ہیٹھ نہ آ جانا
بن کے پھل آزادی دا ٹہک پینا
ظلم نال نہ کتے کمہلا جانا[۸]

غدر شاعروں نے غدر پیاروں کو ہر قسم کے دکھ مصیبتیں ہنس کر برداشت کرنے کے لئے تیار کیا:

غدر غدر کردا سارا جگ ایویں
اپر غدر مچاونا بڑا اوکھا
رولے نال نہ ہووندے غدر یارو
دل دا خون بہاونا بڑا اوکھا
سوچ سمجھ کے رکھنا پیر یارو
اپنا سیس کٹاونا بڑا اوکھا
لیڈر بنن خاطر، دل لوبھدا اے
اے پر جیل وچ جاونا بڑا اوکھا
راج کرے گی اساں دی نسل پیاری
سانوں راج کماونا بڑا اوکھا[۹] ۱

غدری شاعر بلا تفریق مذہب و نسل آزادی کی جدوجہد پر زور دیتے ہیں:

کرو پلٹناں نوں خبردار جا کے
ستے پئے کیوں تیغ چلان والے
مسلمان، پٹھان، بلوان ڈوگر
سنگھ سورمے یدھ مچان والے
طاقت کوئی نہ بڑی فرنگیاں دی
مل کے کرن ہلا ہندوستان والے
ہندوستانیاں مورچے فتح کیتے
برما، مصر تے چین، سوڈان والے[۰] ۲

فوج میں بغاوت پھیلانے کا کام غدری شاعر کا ایک بنیادی تھیم رہا ہے۔ یہ نظم بھی اسی جذبے کا اظہار کرتی ہے :

چنگا وقت ہے غدر مچاونے دا
ہندوستانیو! دیریاں لائیاں کیوں؟
فوجاں والیو! تساں دی مت ماری
لوکاں واسطے کرو لڑائیاں کیوں
ویری تساں دا گھیریا وچ یورپ
ویلا سانبھ لئو' ڈھیریاں ڈھائیاں کیوں[۲۱]

غلامی کی زندگی' ہندوستان کا بدترین استحصال' غربت' بھوک ننگ' مذہبی اختلافات' یہ تمام موضوعات غدری شاعروں نے بار بار اپنی نظموں میں برتے ہیں :

ساری خلق خدائے بیدار بیٹھی
ستا جاگدا توں ہندوستان کیوں نہیں
پاٹے کپڑے جسم کمزور ہویا
جسا جوش تے جگر دا تان کیوں نہیں
کالا چور آکھے سارا جگ سانوں
سکھی وسدی تیری سنتان کیوں نہیں
نہ اوہ رنگ تیرا' نہ اوہ روپ تیرا
نہ اوہ شان تے نالے گمان کیوں نہیں[۲۲]

غلامی کی ذلت کا شدید احساس غدری شاعر کے لئے ناقابل برداشت ہو جاتا ہے :

دھرتی ویل نہ دیوندی' غرق جایئے

بجلی سٹدی کدھروں اسمان کیوں نہیں
ایسی زندگی تو سانوں مرن چنگا
موت کڈھدی اساں دی جان کیوں نہیں
ایویں وانگ دیوانیاں پئے پھردے
لاوندے اٹھ کے اپنا تان کیوں نہیں[۲۳]

غریب الوطنی، پریشان حالی، ہندوستان کی بھوک، برطانیہ کی خوشحالی اور ایسے ہی دیگر موضوعات غدری شاعروں کے پسندیدہ موضوعات ہیں:

پیسہ جڑے نہ نال مزدوریاں دے
جھڑکاں سندیاں کئی سال ہو گئے
پئے چین افریقہ دے وچ بھوندے
وجن ٹھوکراں تے بھیڑے حال ہو گئے
کیہ کجھ کھٹیا جے، مرکن وچ آ کے
دیس چھڈیاں نوں کئی سال ہو گئے[۲۴]

بھارت وچ نہ ڈھونڈیاں ملے کوڈی
مالا مال ہویا انگلستان ویرو!
کتے کھان فرنگیاں دے پیٹ بھر کے
بھکھے ہند دے مرن انسان ویرو!
پین کال تے موت پلیگ آوے
ہیضہ تاپ تے روگ وی کھان ویرو!

موج کل جہان دی لین گورے
ہندی پھوکے ہی سنکھ وجان ویرو![25]

قسمت کل جہان دی تیز ہوئی
بھاگ گر گئے کیوں ہندوستان تیرے
پاٹے کپڑے وانگ شدائیاں دے
رلدے پھرن کیویں نوجوان تیرے
دنیا مست وچ رنگ تماشیاں دے
خستہ حال پھردے جند جان تیرے
بجلی بتیاں جگ وچ زور پایا
پر چمکدے نہیں شمع دان تیرے[26]

آؤ ویس بھائیو! ہندوستان والے
ڈھنگ سوچئے دکھ مٹاونے دا
پیا طوق غلامی دا گل ساڈے
کریئے جتن ہن ایس نوں لاہونے دا
مرنا بھلا غلامی دی زندگی توں
نہیں سخن ایہہ منوں بھلاونے دا
ملک جاگیا چین، جو گھوک ستا
ڈھول وجیا ہند جگاونے دا[27]

انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستان کے استحصال کے حوالے سے مندرجہ ذیل تین نظمیں قابل ذکر ہیں:

ہند لٹ فرنگیاں چوڑ کیتا
دنیا دیکھ کے ہوئی حیران لوکو!
پیسہ سوت سارا ہند دیس والا
انگلینڈ دے وچ لے جان لوکو!
لٹی لئی جاندے دن رات ڈاکو'
بھکھے مرن غریب کسان لوکو!
طلباں چنگیاں دیوندے گوریاں نوں
کھان پین تے عیش اڈان لوکو![۲۸]

پیسہ لٹ لے گئے فرنگی سارے
ویہندے ویہندے تسیں کنگال ہو گئے
تسیں ویر نوں ترسدے کوڈیاں نوں
سونا لٹ ظالم مالا مال ہو گئے
لندن وچ لے گئے گورے کھچ سبھ کجھ
تسیں ویر نوں ٹھن ٹھن گوپال ہو گئے[۲۹]

بھکے مرن بچے کال وچ ساڈے
کھٹی کھان انگلستان والے
برا حال' نہ اوہڑ دی گل کوئی

دنیا وچ رہ گئے دھکے کھان والے
کنک بیچدے، کھان نوں جو ملدے
پیسہ چھڈدے نہیں لگان والے
لائیا ٹیکس فرنگیاں بہت یارو
بھکھے مرن غریب دکان والے[۳۰]

غدری شاعر تحریک آزادی کے لئے مذہبی ہم آہنگی کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ ایک دو مثالیں دیکھئے:

مذہبی جھگڑیاں تے سیں زور پایا
کیتا دیس دا نہیں دھیان ویرو!
سیں بھولیو، مول نہ خبر لگی
جھگڑا گھتیا وید قرآن ویرو
دیس پٹیا، تساں دے جھگڑیاں نے
سیں سمجھدے نہیں، نادان ویرو[۳۱]

ہندو، مومن، مغل، پٹھان مل کے
بیڑہ دیو فرنگیاں گال سنگھو![۳۲]

غدری شاعروں نے ہندوستان کے تمام محب وطن اور آزادی پسند رہنماؤں کو مندرجہ ذیل نظم میں خراج پیش کیا ہے:

مسٹر تلک تے سنگھ اجیت یارو
کیتا سنگھ بھگوان گمان کیوں نہیں
گھوش، رام چند تے برکت اللہ

حسرت موہانی تے ہردیال کیوں نہیں

دیوی میڈم کاما تے کرشن ورما

پنڈی داس تے نند گوپال کیوں نہیں[۳۳]

اس اعتبار سے غدری شاعری ہندوستان کی آزادی کے حوالے سے مذہبی رواداری، قومی اتحاد، سماجی انصاف، ہندوستان کا انگریزی استحصال اور ایسے ہی موضوعات سے بھری پڑی ہے۔ مندرجہ بالا چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ غدر تحریک ہندوستان میں کسی ایک مذہب یا فرقے سے تعلق رکھنے والوں کی تحریک نہیں تھی بلکہ ۱۸۵۷ء کی روایت پر چلتے ہوئے یہ ہندوستان کی مجموعی آزادی کے لئے کام کر رہی تھی اور اس اتحاد کا مظاہرہ جلیانوالہ باغ کے سانحہ تک نظر آتا تھا۔

حوالے

۱۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحات ۵۹۔۶۰

۲۔ عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملے، صفحات ۱۶۴۔۱۶۵

۳۔ ایضاً، صفحات ۱۶۶۔ ۱۶۷

۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۷

۵۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۶۰

۶۔ عزیز الدین احمد، صفحہ ۱۶۸

۷۔ ایضاً، صفحات ۱۶۸۔۱۶۹

۸۔ ایضاً، صفحہ ۱۶۹

۹۔ پریتم سنگھ کینبو، سوتنتر تا سنگرام..... صفحہ ۱۰۱

۱۰۔ عزیز الدین احمد، صفحات ۱۶۹۔۱۷۰

11- Ganda Singh (Ed.) Seditious Literature in the Punjab, Patiala, 1988, p.1

12- Ibid., pp.1-2

۱۳۔ عزیز الدین احمد، صفحہ ۱۷۴

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۰

۱۵۔ غدر دی گونج، نمبر ۲، صفحہ ۲۷

۱۶۔ ایضاً، نمبر ۱، صفحہ ۷

۱۷۔ ایضاً، نمبر ۷، صفحہ ۴

۱۸۔ ایضاً، نمبر ۳، صفحہ ۵

۱۹۔ ایضاً۔

۲۰۔ ایضاً، نمبر ۱، صفحہ ۵

۲۱۔ ایضاً، نمبر ۲، صفحہ ۱۸

۲۲۔ ایضاً، نمبر ۱، صفحہ ۱

۲۳۔ ایضاً۔

۲۴۔ ایضاً، نمبر ۲، صفحہ ۲۲

۲۵۔ ایضاً، صفحہ ۸

۲۶۔ ایضاً، نمبر ۱، صفحہ ۴

۲۷۔ ایضاً۔

۲۸۔ ایضاً، صفحہ ۵

۲۹۔ ایضاً۔

۳۰۔ ایضاً، نمبر ۲، صفحہ ۲۲

۳۱۔ ایضاً، نمبر۱، صفحہ ۱۷

۳۲۔ ایضاً، صفحہ ۱۱

۳۳۔ ایضاً، نمبر ۲، صفحہ ۲۴

چھٹا باب

جلیانوالہ باغ اور پنجابی شاعری

غدر پارٹی کی کارروائیاں ابھی جاری تھیں کہ پہلی عالمی جنگ کے دیو نے برطانوی سامراج کی طاقت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ اسی عرصہ میں تحریک ریشمی رومال بھی ہندوستان کی آزادی کا مقصد حاصل کرنے سے پہلے ہی ناکامی سے ہمکنار ہو چکی تھی۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے ریشمی کپڑے پر کابل میں مولانا محمود الحسن کو جو پیغامات ارسال کئے تھے' وہ بھی سی آئی ڈی کے ہاتھوں میں پہنچ گئے اور تحریک کوئی مثبت نتیجہ ظاہر کئے بغیر ختم ہو گئی۔ ۱۹۱۵ء میں' ملتان میں بڑے پیمانے پر کسانوں کی بغاوت ہوئی۔ اوڈوائر نے اپنی کتاب "INDIA AS I KNEW IT" میں اس بغاوت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ہم نے اپنی معلومات کا انحصار مقامی روایات پر کیا ہے۔ مسلمان کسان ساہوکاروں کے ہاتھوں سے بری طرح لوٹے جا رہے تھے۔ یہ بات مشہور ہو گئی کہ انگریز جنگ میں ہار گیا ہے اور ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے۔ کسان' دیہاتوں سے اکٹھے ہو ہو کر ملتان پہنچنے لگے۔ انہوں نے سرکاری دفاتر تباہ کر دیئے۔ یونین جیک جلا دیا۔ دکانیں لوٹیں اور حساب کتاب کے تمام کاغذات پھونک ڈالے۔ چار ہزار کسانوں کو گرفتار کر کے ملتان کے بندی خانوں میں ڈال دیا گیا۔ پانچ سو سپیشل ٹربیونلوں کے ذریعے سزائیں دی گئیں۔ دیہات میں تعزیری پولیس چوکیاں بٹھا دی گئیں۔[1]

پہلی عالمی جنگ اور پنجاب

پہلی جنگ عظیم کے دوران بھرتی کے نتیجے میں ہندوستان بھر سے سات لاکھ چھبیس ہزار رنگروٹ بھرتی کئے گئے۔ ان میں سے تقریباً نصف یعنی ساڑھے تین لاکھ نفوس صرف پنجاب نے دیئے۔ باقی صوبوں سے رنگروٹوں کی بھرتی کا تقابل کرنے کے لئے حسب ذیل گوشوارہ دیکھنا مفید رہے گا:

صوبے کا نام	آبادی	رنگروٹوں کی تعداد
شمالی مغربی سرحدی صوبہ	۳۰ لاکھ	۳۲۰۰۰
پنجاب	۲۴۰ لاکھ	۳،۵۰،۰۰۰
یو پی	۴۶۰ لاکھ	۱،۴۲،۰۰۰
بمبئی	۲۷۰ لاکھ	۳۵،۰۰۰
بنگال	۴۸۰ لاکھ	۶۰۰۰
بہار اور اڑیسہ	۳۸۰ لاکھ	۸۰۰۰
مدراس	۴۸۰ لاکھ	۴۶،۰۰۰
سی پی	۱۶۰ لاکھ	۵۰۰۰
آسام	۸۰ لاکھ	۱۰۰۰
برما	۱۳۰ لاکھ	۱۳،۰۰۰
اجمیر	۵ لاکھ	۸۰۰۰
ماتحت دیسی ریاستیں	۴۵۰ لاکھ	۸۰،۰۰۰

اوڈوائر کے لفظوں میں پنجاب نے لڑائی کے شروع میں ہی جوان اور افسر ملا کر کوئی ایک لاکھ کی نفری میدان میں اتار دی۔ جنگ کے خاتمے تک پانچ لاکھ پنجابی فوجی الگ الگ پلٹنوں کے شعبوں میں خدمت کر چکے تھے۔ چار سالہ لڑائی کے دوران سارے ہندوستان میں کی گئی فوجی بھرتی کے نصف سے، پنجاب میں سے کی گئی بھرتی کی نفری تین لاکھ ساٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ اپنی تصنیف "جلیانوالہ باغ" میں دی۔ این دت لکھتے ہیں کہ :

"پنجاب کی آبادی تو تمام ملک کی آبادی کا تیرہ فی صد تھی لیکن فوجی رنگروٹوں کی بھرتی یہاں سے ساٹھ فی صد ہوئی۔"

۱۹۱۷ء میں فوجی بھرتی کا کام سول ایڈمنسٹریشن نے سنبھال لیا۔ مئی میں حکومت ہند نے ایک مرکزی فوجی بھرتی

بورڈ قائم کیا۔ اسی طرح کے صوبائی فوجی بھرتی بورڈ قائم کئے گئے۔ صوبائی بورڈ کا سربراہ صوبے کا لیفٹیننٹ گورنر ہوتا تھا۔ اوڈوائر کے لفظوں میں "یکم جولائی ۱۹۱۷ء سے لے کر ایک سال میں' پنجاب میں سے دو لاکھ چار ہزار رنگروٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ "حکومت پنجاب کے ایڈیشنل سیکرٹری مسٹر ایل فرنچ کے مطابق جولائی ۱۹۱۷ء سے لے کر مارچ ۱۹۱۸ء تک ۱۳۶۱۰ کی ماہانہ اوسط بھرتی کے حساب سے کل بھرتی ایک لاکھ بائیس ہزار چار سو بانوے تک پہنچ گئی تھی' لیکن مائیکل اوڈوائر کے حساب کے مطابق صرف سات مہینوں میں ایک لاکھ لڑاکا رنگروٹ سپاہی بھرتی ہوئے۔ فروری ۱۹۱۸ء تک بھرتی کی مہموں نے پنجاب کو ایک طرح سے تھکا مارا تھا اور مزید بھرتی کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔[۲]

مندرجہ بالا اعداد و شمار فوجی بھرتی کے معاملے میں' بظاہر پنجاب کے زبردست جوش و خروش کو ظاہر کرتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جنگ عظیم میں برطانوی سامراج کو شکست سے بچانے کے لئے پنجاب نے اپنے آخری بچے تک کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

فوجی بھرتی کے خلاف پنجابی مزاحمت

اگر ہم ان اعداد و شمار کو سیاق و سباق سے الگ کر کے دیکھیں تو یقیناً ہر کوئی اسی نتیجے پر پہنچے گا' لیکن اس زبردست فوجی بھرتی کے پیچھے چند ایسے معاشی' سماجی اور سیاسی عوامل کام کر رہے تھے جن کی طرف ہم اس مقالے کے پہلے حصے میں اشارے کر چکے ہیں۔ انگریزوں نے پنجاب میں جس قسم کی جاگیرداری کو رواج دیا تھا اس میں ایک آدمی سینکڑوں ہزاروں کسانوں کی محنت اور جان و مال کا مالک بن سکتا تھا۔ چنانچہ فوجی بھرتی کے سلسلے میں ایک آدمی کی رضامندی سینکڑوں ہزاروں افراد کی مرضی بن جایا کرتی تھی۔ جنگ کے ابتدائی سالوں میں تیزی سے ہونے والی فوجی بھرتی نئے جاگیردارانہ نظام کی مرہون منت تھی۔ انعام' جاگیر اور خلعت کے لالچ میں فوجی بھرتی کرانے والے کارکنوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو دیکھتے ہی دیکھتے بڑے جاگیرداروں میں تبدیل ہو گیا۔ یہی جاگیردار اپنے سینکڑوں مزارعین کو زبردستی جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے۔

زمین پر پڑنے والے ناقابل برداشت بوجھ' بے کاری اور فاقہ کشی نے بھی لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے پر مجبور کیا۔ ساہوکاروں کی زیادتیوں نے کسانوں کو فوجی بھرتی کی صورت میں راہ فرار مہیا کر دی۔ وہ ماہانہ تنخواہ میں سے اپنے سود در سود قرضوں کو چکانے کے خواب دیکھ رہے تھے۔

ڈیرہ غازی خاں ضلع کی وار ہسٹری کی رپورٹ میں ۱۹۱۸ء کے ابتدائی دنوں میں فوجی بھرتی کے خلاف ہونے والی کاروائیوں کی تفصیل دیکھی جا سکتی ہے۔ فروری ۱۹۱۸ء میں بلوچستان کے مری قبیلے نے فوجی بھرتی کے کام میں مزاحمت کے سلسلے میں زبردست کردار ادا کیا۔ بلوچستان انتظامیہ کی درخواست پر حکومت پنجاب نے ڈیرہ غازی خان سے فوجی مدد بھیجنے کے ساتھ ساتھ اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اینڈریوز کی سرکردگی میں پولیس اور بلوچ لیوی کے دستے بھی روانہ کئے۔ سردار جمال خاں لغاری اپنے قبیلے کے لوگوں سمیت اینڈریوز کی مدد کے لئے اس کے ساتھ تھا۔ ابھی یہ فوجی مدد برخان تحصیل پہنچی بھی نہیں تھی کہ مری اور دیگر قبائل نے پہلی مارچ کو کھر پر حملہ کر کے ڈاک خانہ' ریسٹ ہاؤس اور دوسری سرکاری عمارتیں جلا دیں۔ سرکاری اسلحہ لوٹ لیا۔ مری اور کھیسران قبیلوں نے پانچ مارچ کو اینڈریوز کو پسپا ہونے پر مجبور کر کے پوری تحصیل کو قبضے میں لے لیا اور تمام سرکاری خزانہ لوٹ لیا۔ کھیسران لشکر نے کچھ اور سرکاری مقامات کو بھی لوٹا اور بارڈر ملٹری پولیس چوکیوں کو آگ لگا دی۔ پندرہ مارچ کو کھتران اور مری قبیلے کے لشکر نے فورٹ منرو بل پر قبضہ کر کے سرکاری عمارتیں جلا دیں۔ لیکن خود ایک حملے کا شکار ہو کر بھاری نقصان سے دوچار ہوئے۔ اس موقعہ پر بلوچ تمن داروں نے دروں کا دفاع کر کے انگریزوں کو مزید تباہی سے بچا لیا۔ کھتران اور مری لشکر کی شکست نے اس علاقے میں انگریزوں کے لئے فوجی بھرتی کا راستہ صاف کر دیا۔ ہدیانی سرداروں کو سزائیں دی گئیں اور بھاری جرمانے کئے گئے کیونکہ انہوں نے بھی باغیوں کا ساتھ دیا تھا جبکہ گرچانی اور بزدر سرداروں کو' وفاداری کے صلے میں لیفٹیننٹ گورنر کے دربار میں خلعتیں عطا کی گئیں۔[۳]

فوجی بھرتی کے خلاف ضلع شاہ پور کے لوگ بھی پیش پیش رہے۔ "وار سروسز آف شاہ پور ڈسٹرکٹ" کے مطابق مردوال کے اعوان عام طور پر قانون شکن ہوتے ہیں۔ مردوال میں فوجی بھرتی کے خلاف ہونے والی مزاحمت کو سختی سے کچلنے کے لئے ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت متعلقہ افراد کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے۔ جب سب انسپکٹر

پولیس چند معززین کے ساتھ گرفتاریوں کے لئے مردوال پہنچا تو اسے "ناگوار حالات" کا سامنا کرنا پڑا۔ قریبی دیہات کے چند معززین کی مدد سے ڈپٹی کمشنر نے مردوال کا ایک ہنگامی دورہ کیا۔ گاؤں کے "ہوش ٹھکانے" لگا دیئے گئے اور سو آدمیوں کو زبردستی بھرتی کیا گیا۔[۴]

اسی طرح موضع لک میں بار کے "جانگلیوں" نے فوجی بھرتی کے خلاف شدید مزاحمت کی۔ یہاں بھی ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے تحت سرکردہ باغیوں کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیئے گئے اور پولیس کی ایک بھاری جمعیت وہاں پہنچ گئی۔ حکام کو پولیس کی روانگی کے بعد گاؤں والوں سے شرافت کی امید تھی لیکن یہ امید پوری نہ ہوئی۔ لک، بنگہ اور اٹی کے ایک ہزار "شرپسندوں" نے پولیس پر حملہ کر دیا۔ بہت سے حملہ آور مارے گئے یا زخمی ہوئے۔ قریبی دیہات کے شرفاء نے پولیس کی مدد کی۔ ٹوانوں کے علاوہ مکنوں، جھموں، سیدوں اور کلیاروں نے حالات پر قابو پانے اور علاقے کا امن و سکون تباہ کرنے والے باغیوں کو گرفتار کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ میجر سر عمر حیات خان ٹوانہ اور آغا سعادت علی خاں زاہد کی خدمات تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ محفوظ رہیں گی۔

ضلع شاہ پور کے ایک اور گاؤں باہک لڑکا میں بھی حالات قابو سے باہر ہو گئے۔ لک میں باغیوں کے کچلے جانے کے باعث اس گاؤں کے لوگ خوفزدہ ہو کر فوج میں بھرتی ہونا شروع ہو گئے۔ مارچ اور اپریل ۱۹۱۸ء میں کافی لوگ فوج میں چلے گئے لیکن چھٹیاں لے کر مفرور ہو گئے۔ گھلا پور کے گردو نواح میں رانجھا قبیلے کے لوگوں نے بھرتی کے خلاف "سازش" کی۔ بھرتی کے سلسلے میں بھلوال کے تحصیلدار سید نادر حسین نے "باہک لڑکا" گاؤں کا دورہ کیا۔ رانجھوں نے اس پر حملہ کر کے اسے قتل کر دیا۔ گاؤں کے لوگوں نے انہیں پناہ دی اور وہ کئی مہینوں تک گرفتار نہ کئے جا سکے۔ دسمبر ۱۹۱۸ء میں انہیں چند شرفاء کی مدد سے پکڑ لیا گیا۔ سپیشل ٹریبونل نے ان پر مقدمہ چلا کر چار کو موت اور بارہ کو عمر قید کی سزا دی۔ شرفاء میں ایم شیر علی کے ایم حسن خان اور تاج محمود ذیلدار کے نام قابل ذکر ہیں۔[۵]

۲۷ نومبر ۱۹۲۳ء کے "بمبے کرانیکل" کے مطابق ضلع شاہ پور کے گاؤں "ادیان" کے لوگوں نے بھاگ کر بھرتی کے عذاب سے بچنے کی کوشش کی۔ تحصیل بھلوال کے گاؤں تخت ہزارہ میں عورتوں کو گالیاں دی گئیں اور انہیں کئی

دوسرے طریقوں سے بے عزت کیا گیا۔ بوڑھوں کے چوتڑوں میں کانٹے دار جھاڑیاں چبھوئی گئیں۔[۶]

بھرتی کے خلاف لوگوں میں تناؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ گڑبڑ سے مجبور ہو کر حکومت پنجاب کو یکم اپریل سے ۱۵ جون تک عارضی طور پر بھرتی کا کام بند کر دینے کی ہدایت جاری کرنا پڑی۔ لیکن انہی دنوں جرمنی کے زبردست حملے کے نتیجے میں جنگ کا پانسہ پلٹ گیا۔ حکومت پنجاب نے بھرتی روکنے کا حکم واپس لے لیا۔ برطانیہ کے وزیراعظم نے ایک اپیل جاری کی جس میں ہندوستان سے یکم جون ۱۹۱۸ء سے ایک سال کے اندر اندر پانچ لاکھ رنگروٹ بھرتی کرنے کا مطالبہ کیا۔ مسٹر ایل فرنچ کے مطابق "اس مطالبے کو پورا کرنے کے لئے ضروری سمجھا گیا کہ بھرتی میں ۲۵ فیصد اضافہ کر دیا جائے۔ وی این دت کا کہنا ہے کہ چار مئی کو پنجاب کے کمشنروں کی ایک میٹنگ میں بیس ہزار غیر لڑاکا اور ایک لاکھ اسی ہزار لڑاکا رنگروٹ بھرتی کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ فیصلہ یہ جاننے کے باوجود کیا گیا کہ پچھلے نو ماہ میں زبردست کوششوں کے بعد بمشکل تمام بھرتی کا کوٹہ پورا ہوا تھا۔

حکومت پنجاب نے جان لیا تھا کہ پرانے طریقوں سے بھرتی کا موجودہ مطالبہ پورا نہیں کیا جا سکتا۔ چار مئی کی میٹنگ میں ڈویژنل کمشنروں نے سفارش کی کہ ایک ایکٹ یا آرڈیننس کے ذریعے حکومت پنجاب کو یہ اختیار دیا جائے کہ وہ علاقے، ضلعے یا شہر میں، اگر لوگوں کی رضامندی کے ساتھ ممکن نہ ہو تو جبری طور پر کوٹہ پورا کیا جائے۔ جبری بھرتی کے لئے ایک بل کا مسودہ تیار کر لیا گیا۔ "پنجاب فوجی بھرتی بورڈ" کی طرف سے ایک سب کمیٹی بنائی گئی جس کے ضلعی ممبروں میں عمر حیات خان، گھبیر سنگھ، مہدی شاہ اور لال چند غیر سرکاری نمائندوں کے طور پر شامل کئے گئے۔ اس سب کمیٹی نے پورے ہندوستان میں فوجی بھرتی کو لازمی قرار دینے کی سفارش کرتے ہوئے زور دیا کہ پنجاب میں اس پر فوراً عمل ہونا چاہئے۔ سر مائیکل اوڈوائر نے حکومت ہند کو بھیجے گئے ۱۵ جون کے ایک نوٹ میں سب کمیٹی کی لازمی اور جبری بھرتی کی سفارشات کی زبردست حمایت کرتے ہوئے انہیں جلد سے جلد منظور کرنے پر زور دیا۔ مرکزی بھرتی بورڈ نے یہ سوچ کر کہ تمام ملک کے لوگوں پر جبری بھرتی کا قانون ٹھونسنا بے حد مشکل ہو گا، ان سفارشات کو رد کر دیا۔ "اوڈوائر بنام نائر" مقدمے میں بیان دیتے ہوئے اوڈوائر نے دعویٰ کیا تھا کہ بھرتی کے لئے جبر سے کام نہیں لیا گیا۔ اس کے لفظوں میں "کمشنروں کو ہدایت کی گئی تھی کہ بھرتی کے لئے طاقت یا جبر کا استعمال نہ

کیا جائے۔ صرف ایک بار کچھ آدمیوں نے مجھے بتایا تھا کہ انہیں زبردستی بھرتی کیا گیا ہے۔"[۷۷]

اوڈوائر کے مطابق "پنجاب نے فوجی بھرتی کی کامیابی کے لئے پورا پورا زور لگایا اور میٹنگ کے آخری دنوں میں یہ بالکل تھک ہار گیا تھا۔ اگست اور ستمبر ۱۹۱۸ء میں اکیس اکیس ہزار سے زائد بھرتی کے ریکارڈ توڑے گئے۔ ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر ضلع میں بھرتی دربار سجائے جاتے۔ ہونے والی بھرتی کے مفصل اعداد و شمار شائع کر کے پسماندہ اور غریب ضلعوں میں بانٹے جاتے۔ بھرتی کرانے والوں کو لمبے چوڑے انعام ملتے۔ نئے رنگروٹوں کی ابتدائی تربیت کے لئے اور انہیں پلٹنوں میں شامل کرنے کے لئے ڈپو قائم کئے جاتے۔ اس کے علاوہ ہر نئے رنگروٹ کو پچاس روپے خصوصی بونس دیا جاتا۔ ان ترغیبات کے نتیجے میں تذبذب میں مبتلا افراد بھی بھرتی ہو جاتے۔

سر سنکرن نائر نے ۱۹۲۲ء میں "گاندھی اور انارکی" نامی ایک کتاب شائع کی۔ اس کتاب میں فوجی بھرتی کے سلسلے میں سر مائیکل اوڈوائر پر کچھ الزامات لگائے گئے تھے۔ اوڈوائر نے چیلنج کیا کہ اسے جان بوجھ کر بدنام کرنے کے لئے ایسا کیا گیا ہے۔ اس مقدمے کے دوران نائر نے بھرتی کے سلسلے میں زیادہ وضاحت کے ساتھ باتیں کہیں۔ نائر کے لفظوں میں "لوگ اس جبر و تشدد کے باعث دہاڑیں مار مار کر روتے تھے۔ دیہات سے لوگوں کو زبردستی پکڑ کر لے آتے اور خاردار جھاڑیوں سے ان کو پیٹتے۔ انہیں ان کی عورتوں کے سامنے الف ننگا کر کے ہاتھ پیچھے کی طرف باندھ کر' اور سروں پر جوتے رکھ کر کھڑا کر دیا جاتا۔ صفائی کے گواہ ولی نے اس بات کی تصدیق کی کہ بھرتی کرنے والے تحصیل داروں کو دیکھتے ہی لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

ولی نے اپنا بیان لکھواتے ہوئے کہا:

> "وہ عورتوں سے کہتے ہم خاردار چھاپے' ڈھینگرے اور جھاڑ جھنکاڑ لے آئے ہیں۔ ہم تمہاری شلواریں اور گھگھریاں اتار کر تمہیں ان پر بٹھائیں گے۔ پھر وہ انہیں رات حوالات میں بند کر دیتے اور ان کے کپڑے اتار کر خاردار جھاڑیاں اپنی ٹانگوں کے درمیان رکھنے پر انہیں مجبور کیا جاتا۔"[۸۷]

"جلیانوالہ باغ" میں دت لکھتے ہیں :

"مقامی جیلوں سے قیدیوں کو رہا کر کے انہیں بھرتی میں مدد دینے کے کام پر لگایا جاتا۔"

اوڈوائر بظاہر اس بات پر اڑا رہا کہ یہ تمام الزامات جھوٹے ہیں لیکن جلیانوالہ باغ کے حادثے کے بعد ہنٹر کمیٹی کے سامنے اس نے اپنی خفیہ گواہی میں اس بات کا ذکر کیا کہ لوگوں کو دبائے جانے کی چند شکایتیں اس نے سنی تھیں۔ "ڈس آرڈر انکوائری کمیٹی" کے سامنے شہادت دیتے ہوئے خان بہادر فضل حسین ممبر لیجسلیٹو کونسل نے بھی بتایا کہ یورپی افسروں اور ماتحت ہندوستانی عملے کے خلاف حکومت کو بھرتی کے سلسلے میں ان کے قابل اعتراض طریقے اختیار کرنے کی شکایتیں ملی ہیں۔

لال سنگھ کی شہادت میں کہا گیا ہے کہ جب لوگوں کو معلوم تھا کہ رنگروٹ بھرتی کرنے والی ایجنسی خود حکومت ہے تو وہ شکایت کس کے آگے اور کیسے کرتے؟

"پنجاب میں جبری بھرتی کے بارے میں میمورنڈم" بھی ایسی ہی کئی کہانیاں سناتا ہے۔ یہ میمورنڈم پنجاب کے لیفٹیننٹ گورنر کی بھرتی کے سلسلے میں ہدایات' فوجی خدمت کے بارے میں ان کے نوٹ اور ۸ جون ۱۹۱۸ء کو قائم کئے گئے صوبائی بھرتی بورڈ کی سب کمیٹی کی قیمتی رپورٹ پر مبنی ہے۔ یہ میمورنڈم ظاہر کرتا ہے کہ سرکاری کارندے اکثر اپنے اختیارات کا استعمال کرتے تھے اور کئی بار اس بات پر فساد بھی ہو جاتے تھے۔ شاہ پور کے ڈپٹی کمشنر نے اعتراف کیا کہ ان کے ضلع میں فوجی رنگروٹوں کی بھرتی کے سلسلے میں ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۰۷ کو ناجائز طور پر استعمال کیا گیا۔ شاہ پور میں جبری بھرتی کی زبردست مہم کے نتیجے میں لوگوں میں وسیع پیمانے پر ناراضگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس ناراضگی کی تفصیل فضل حسین نے اپنے بیان میں وضاحت کے ساتھ بتائی ہے :

"لوگوں کے وارنٹ جاری کئے گئے لیکن دیہاتیوں نے انہیں افسروں کے سامنے پیش نہیں کیا۔ اس لئے انہیں گرفتار کرنے کے لئے پولیس کی بھاری جمعیت لوگوں پر چڑھائی گئی۔ پولیس کے آنے پر بلوہ ہو گیا۔ ڈیڑھ سو آدمی گرفتار کئے گئے۔ ان میں سے بیشتر کو بلوے میں حصہ لینے کے جرم میں سزائیں دی گئیں۔"[۹۲]

ایل فرینچ، ایڈیشنل سیکرٹری حکومت پنجاب نے لکھا ہے کہ بہت سے لوگوں کو حلقوں میں بھرتی کے کام پر لگایا گیا تھا اور اس میں اس طرح کا ڈھکا ہوا جبر ضرور تھا۔

اٹک کے ڈپٹی کمشنر نے بھرتی کے مروج نظام کو جبری رضامندی کا نام دیا۔ ملتان ڈویژن میں کمشنر نے رائے ظاہر کی کہ ملتان اور مظفر گڑھ ضلعوں میں کئی مقامات پر رنگروٹوں کی بھرتی کے باعث گڑبڑ پیدا ہوئی۔

اس نے کہا:

"اس ڈویژن میں لوگ رنگروٹوں کی بھرتی کرتے تھے۔ ان کا کام بڑا مشکل تھا۔ انہیں لوگوں کی رکھائی، لاپرواہی، جھینپ، حتیٰ کہ کھلی مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ جس کے باعث ملتان اور مظفر گڑھ کے ضلعوں میں بدقسمتی سے کئی مقامات پر فسادات ہوئے۔ خون خرابہ ہوا، حکومت کی حکم عدولی ہوئی۔

کمشنر ملتان نے ملتان اور مظفر گڑھ کے ڈپٹی کمشنروں کو بھرتی کے لئے زیادہ سختی پر ٹوکا تھا لیکن وہ اپنے ایک نوٹ میں افسوس ظاہر کرتا ہے کہ

"مجھے ڈر ہے کہ کچھ آدمیوں کو چھوڑ کر ضلع کے کھاتے پیتے لوگوں نے اپنا فرض پورا نہیں کیا۔ اپنے خاندانوں کو بھرتی کرانے کی بجائے نچلے طبقے کے لوگوں کو یا تو دبایا گیا یا انہیں لالچ دے کر خریدنے کی کوشش کی گئی۔"

اس طرح کئی دیہات کے مکھیوں نے جب دھونس اور دھکے شاہی کا وطیرہ اپنایا تو کہیں کہیں بدامنی بھی پھیلی۔ یہ رویہ صوبائی بھرتی فوجی بورڈ" کے غیر سرکاری ممبران نے بھی محسوس کیا۔"

"اس وقت رضاکارانہ بھرتی کا جو طریق کار رائج ہے۔ اس میں خود سری اور دھکے شاہی کا دور دورہ ہے۔ اس کے مقابلے میں اگر جبری بھرتی کی جاتی تو اس سے لوگ کم پریشان ہوتے۔ دوسرے نتائج سب کے لئے یکساں اور خاطر خواہ ثابت ہوتے۔"

صوبائی بھرتی بورڈ کی سب کمیٹی کی میٹنگ میں سی ایم کنگ نے کہا

"تذبذب میں مبتلا رہنے والوں پر دباؤ ڈالا جاتا ہے۔ زمینداروں کو یہ شکایت ہے کہ ماتحت سرکاری عملے نے ہمیں تنگ کر کے زبردستی فوج میں دھکیلا ہے۔"

"ڈس آرڈر انکوائری کمیٹی" کی رپورٹ چھٹی جلد کے مطابق چکوال تحصیل میں انکم ٹیکس لگائے جانے کے ایک مقدمے میں مدعی کی درخواست محض اس لئے رد کر دی گئی کہ نہ تو اس نے رنگروٹ بھرتی کرائے' نہ جنگی قرضے میں حصہ ڈالا اور نہ ریلیف فنڈ میں کوئی رقم دی۔[10]

جہلم اور راولپنڈی کے علاقوں میں فوجی بھرتی کے خلاف ایک ایک گاؤں میں مزاحمت ہوئی۔ تحصیل پنڈ دادن خان کے اکثر دیہات دباؤ اور مزاحمت کی شدید لپیٹ میں آئے۔ بے شمار مقامی روایات کے مطابق متعدد جھڑپوں میں دونوں طرف کے لوگ مرے۔ نوجوانوں کو زبردستی فوج میں بھرتی کرنے کے لئے ان کی نوجوان بہنوں کے ساتھ ناروا سلوک کیا گیا۔ کئی لڑکیاں پراسرار طور پر غائب کر لی گئیں۔ کتنی ہی بوڑھی آنکھیں اب چشم تصور میں اس عہد کی بربریت کو دیکھتی ہیں تو کانپ اٹھتی ہیں۔ راولپنڈی کے علاقے میں ان دنوں گائے جانے والے اکثر گیتوں میں زبردستی جنگ پر بھیج دیئے جانے والے بچوں کا دکھ محسوس کیا جا سکتا ہے۔

گڈی سرکاری پلاں تو لنگھنی چھم کر کے
بچڑے ماواں نے گھنی ویندی آ بند کر کے[11]

رنگروٹ بھرتی کے بارے میں اوڈائر نے اپنے ایک نوٹ میں لکھا کہ بھرتی کا موجودہ طریقہ' کسی قسم کی جبری بھرتی کے مقابلے میں زیادہ بے چینی اور مخالفت کو جنم دیتا ہے۔ اس نے اس بات کو بھی تسلیم کیا کہ چار اضلاع میں بھرتی کے ناجائز طریقے استعمال کرنے کے باعث گڑبڑ پیدا ہوئی۔ ۱۹۱۷ء میں ۲۶'۷۰۲ فوجی مفرور ہو گئے۔ اور یوں بے شمار خاندانوں کے لئے کمانے والا کوئی نہ رہا اور لوگوں میں دہشت پھیل گئی۔ پولیس نے گولیاں چلائیں۔ ایک خفیہ رپورٹ میں ہوم ممبر سر ولیم ونسٹ نے لکھا:

"یہ ممکن ہے کہ فوجی بھرتی اور جنگی قرضے کی وصولیوں کے لئے' استعمال کئے گئے طریقوں سے لوگوں میں بے چینی بڑھی ہو۔" بمبئی کرانیکل کی ۱۷ ستمبر ۱۹۱۹ء کی رپورٹ کے مطابق ۱۹۱۸ء میں'

پنجاب میں فوجی بھرتی اپنے عروج پر تھی۔ دسمبر ۱۹۱۷ء میں ملتان ڈویژن میں بھرتی پانچ سو اسی نسبت ایک (۱ : ۵۸۰) کی شرح سے ہوئی۔ جو نومبر ۱۹۱۸ء میں ترانوے نسبت ایک (۱ : ۹۳) کی شرح تک بڑھ گئی۔ اس طرح مظفر گڑھ ضلع میں، دسمبر ۱۹۱۷ء میں بھرتی کی شرح آٹھ سو نسبت ایک (۱ : ۸۰۰) تھی، جو دسمبر ۱۹۱۸ء میں ایک سو ترپن نسبت ایک (۱ : ۱۵۳) تک بڑھ گئی۔[۱۲]

بھرتی سے انکار کرنے والوں کو جرمانہ کی سزا دی جاتی۔ نوکری سے ہٹا دیا جاتا اور ٹیکس لگا دیا جاتا۔ کئی بار پورے گاؤں کی بے عزتی کی جاتی۔ روزنامہ "نیشن" لاہور کی ۱۸ نومبر ۱۹۲۳ء کی اشاعت میں بتایا گیا ہے کہ کئی بار دیہاتیوں کو نہری پانی سے روک دینے کی دھمکیاں دی جاتیں اور اکثر ایسا بھی کیا جاتا۔ جن لوگوں کی ضابطہ فوجداری کی دفعہ ۱۰۷ اور دفعہ ۱۶۰ کے تحت گرفتار کیا گیا انہیں فوج میں بھرتی ہو جانے پر چھوڑ دیا جاتا۔[۱۳]

جنگ اور شاعری

احمد سلیم کے لفظوں میں جنگ کے خاتمے پر پنجاب بھر میں جو لوک گیت گائے جا رہے تھے۔ ان میں فتح کی شادیانوں کی بجائے آہیں اور کراہیں تھیں۔ ان چارپائیوں کی خاموش فریاد تھی جن پر لڑکیوں کو اب بھی تنہا سونا تھا۔ کیونکہ ان کے محبوب ایک سامراجی جنگ کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ مائیں، بہنیں اور بیٹیاں اپنے گمشدہ رشتوں کی تلاش میں تھیں۔ پنجاب میں جنگ اور امن کے موضوع پر جتنے لوک گیت ملتے ہیں اتنے شاید محبوب کے علاوہ کسی اور موضوع پر نہیں ملتے۔ اس حوالے سے پنجابی شاعری کا میدان بے حد وسیع اور زرخیز ہے۔ ایک طرف اس عہد کے پنجابی شاعروں نے فوجی بھرتی کے خلاف عوامی جذبوں کو زبان دی تو دوسری طرف لوک شاعروں نے، جن میں لام پر جانے والوں کے لئے عورت کے جذبوں کا اظہار کیا گیا تھا، دل کو چھونے والے گیتوں، ڈھولوں، ماہیوں اور بولیوں کا بیش بہا خزانہ پیش کیا۔

پنجابی شاعر نانک سنگھ نے اپنی نظموں میں فوجی بھرتی کے خلاف عوامی جذبوں کا بھرپور اظہار کیا۔ اپنے ایک گیت

میں وہ کہتے ہیں:

بھرتی کر کے ویر پیارے' سنگ یورپ وچ بھیجے سارے
ہوئیاں جد لڑائیاں' چٹھیاں درداں دیاں
لکھ سرکارے پائیاں
آپ دی خاطر ویر کھائے' حکم تہاڈے سدا وجائے
چنگیاں قدراں پائیاں' چٹھیاں درداں دیاں
لکھ سرکارے پائیاں
بدلے اوس دے ملیا ڈائر' جس نے آ کے کیتے فائر
رب دیاں ایہو رضائیاں' چٹھیاں درداں دیاں
لکھ سرکارے پائیاں[۱۳]

چاندنی راتوں میں گاؤں کی گوریاں گدھا ناچتے ہوئے جنگ پر گئے محبوب کو اس طرح یاد کرتی ہیں:

پپلاں اتے آئیاں بہاراں' بوہڑاں نوں لگیاں گوہلاں
جنگ نوں نہ جاوے: دل دے بول میں بولاں

پپلا وے میرے پیکے پنڈ دیا! تیریاں ٹھنڈیاں چھاواں
ڈھاب تیری دا ٹھنڈا پانی' اتوں بور ہٹاواں

سبھے سہیلیاں سوہرے گئیاں' کس نوں حال سناواں
چٹھیاں بیرنگ بھیجدا' کہڑی چھاؤنی لوا لیا ناواں

جنگ کے دنوں میں بصرہ' ہمارے لوک گیتوں کا بہت بڑا حوالہ بن گیا۔ محبوب کی جدائی کا بہت بڑا استعارہ۔ مثلاً

بصرے دی لام ٹٹ جائے

میں رنڈیوں سہاگن ہوواں

گل کرتہ نسرے دا

ہولی ہولی چل گڈیئے' وچ مسافر بھرے دا

نیر اکھیاں دی مک گئی اے

گڈی تیری چن ڈھولنا! جا بھرے رک گئی اے

گڈی لنگھ گئی آ شوں کر کے

ہن کاہنوں روندی ایں جندے' بھرے نوں منہ
کر کے

پھران گیتوں میں جذبوں کی نزاکت قابل غور ہے

بوٹا پکیا امبیاں دا

ٹر گیا لام تے چنا! ڈاہڈا راج فرنگیاں دا

ووہٹی سپاہی دی

اگ بال کے دھوئیں دے پج رووے

لام توں سپاہیا وے

کدی بن کے پراہونا آوے!

ان گیتوں میں بھائی' بیٹے' شوہر' محبوب کی جدائی کے نئے نئے رنگ دکھائی دیتے ہیں۔ اس سماجی کیفیت کی چند تصویریں مندرجہ ذیل گیتوں میں دیکھیں :

دیور' جیٹھ' گھر والا
لام گئے تن گبھرو

پت ماواں دے لڑدے
پار سمندراں دے

دوہٹی سپاہی دی
لام دے ناں توں ڈردی

دھنی اور پوٹھوہار کی زمین سخت اور نامہربان ہے۔ یہاں کے بانکے چھیلے اور لمبے تڑنگے گھبرو' زمین کی اس طبعی کمزوری کے کارن ہل کی ہتھی سے اپنی سانجھ استوار نہ کر سکے۔ برطانوی سامراج کو جب جنگ کا ایندھن بنانے کے لئے زبردست افرادی قوت کی ضرورت پڑی تو مقامی دستکاریاں اجڑ گئیں۔ کارخانے ویران ہو گئے۔ زمین پہلے ہی پتھریلی تھی چنانچہ نوجوانوں کو میدانِ جنگ کی طرف ہنکایا گیا۔ انگریز مستشرقین نے ان کی بہادری کے ترانے گائے اور یوں صنعت میں اپنے مستقبل کو تلاش کرنے والی دھرتی فوجی' رنگروٹوں کی مشین بن کر رہ گئی۔ پنڈ دادن خان جس کی آبادی کبھی ایک لاکھ کے قریب تھی جو اپنے کارخانوں کے لئے مشہور تھا اور ضلع کا صدر مقام تھا بتدریج پس منظر میں چلا گیا۔ کارخانوں کا نشان تک باقی نہ رہا اور آبادی سکڑ کر دس ہزار تک آ گئی۔ پنڈ دادن خان کی یہ قسمت' دھنی اور پوٹھوہار کے کتنے ہی ایسے ابھرے ہوئے شہروں کی قسمت بنی رہی ہے جو ابھرنے سے پہلے ہی ڈوبتے چلے گئے۔ دو عظیم جنگوں نے اس علاقے میں "مارشل ریس" کے نظریئے کو جنم دیا۔ اس نظریئے کی بنیاد' دوسروں پر غلبہ حاصل

کرنے کے جذبے کے تحت رکھی گئی۔ برطانوی سامراج کا یہ کھیل' اس علاقے کے تخلیقی لوگوں کے ذہن چھین کر لے گیا اور اس کے بدلے ایک اندھی طاقت بن گئے' جس سے وہ خود اپنا بھلا تو نہیں کر سکتے تھے لیکن برطانوی سامراج کو جنگیں جیت کر ضرور دے سکتے تھے۔ یہاں کی عورتوں نے دو بڑی جنگوں کے دوران جو لوک گیت تخلیق کئے وہ نہ صرف اس سرزمین کے بیٹوں کی سلامتی کی آرزو ہیں۔ بلکہ یہ دعا بھی کہ جنگ ختم ہو اور جہاز کنارے آ لگیں۔

ماواں دے سب بچڑے شالا پردیس

مینڈے بچڑ یو وے

مولا لام تروڑے نیں

پنج تن راکھا نیں پترو

وے اللہ خیریں موڑے نیں

شالا باجرے دے دانے

ساڈا ویر جوانیاں مانے

مینڈے مرشد توں لاماں دی صلح کرا

فوجاں ہسڑیاں

وے جہاج کنارے لا

آ جاؤ وے اللہ آسے

ماء بسم اللہ کرینے

مینڈھے مرشد توں فوجاں دی صلح کرا

فوجاں گھر آون

وے جہاج کنارے لا

صاحباں نی صاحباں بی بی

پا چکنے ناں چولا

بچے ترت ملاسی

خیریں رب مولا

رب بھلا کرے ا نکھیلا

شالا منشی سینڈا

آوڑیوں وے آوڑیوو

مینڈا پتر بوہنگرو

ماء بسم اللہ کریندی اے

رب نیاں خیریں اندروں اندروں

مولا ساڈا ہن پار سمندروں

ڈاہڈا فضل کریسی

ماواں دے سب بچڑے

ربا پردیسی

کنی وچ خیریں وے شالا

پئی رجھدی کھیر

خیریں آولنا بھیناں وے

ڈاہڈے سوہنے ویر

مینڈھے مرشد وے

لاماں دی صلح کرا

فوجاں ہسڑیاں

جہاج کنارے لا

سیں آوو وے پترو

کھڑے کھڑے راہیں

دیواں بال دھراں راتیں

مینڈھے بچیو خنگاہیں

مولا ساڈا ہن

ڈاہڈا فضل کریسی

ماواں دے سب بچڑے

ربا پردیسی

گھر گھر بلدے ربا

خیریں سوہنے دیوے

شالا سائیں صاحباں دا

خیریں سکھ لدھیں جیوے

مینڈھے مرشد دے

لاماں دی صلح کرا[۱۵]

اسی علاقے کے جوانوں کے لئے تڑپتی ماؤں کا ایک اور گیت' ان سرکاری گاڑیوں کا ذکر کرتا ہے جو ماؤں کے جگر گوشوں کو ان سے چھین کر دور پردیسوں میں سامراجی جنگ کا ایندھن بنانے کے لئے لے جا رہی ہیں :

شالا رب سائیں نیاں رکھاں "بھرتی چاہوئے لکھاں

گڈی سرکاری' پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی ویندی آ بند کر کے

شالا اتے اتے وطیں ٹیساں، بھلے لوک کرینے ریساں

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی ویندی آ بند کر کے

شالا اتے اتے دل وے، چھٹیاں لے ماواں کوں مل وے

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی ویندی آ بند کر کے

شالا ہیٹوں لینی آں شے، مینڈھے بچڑے جیون ترے

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی ویندی آ بند کر کے

شالا ڈھگڑی تے مقام۔ آنیاں وینیاں کراں سلام

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا اکٹھا آیا ٹانڈا، خیریں آوے جوڑا چانجا

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا مینڈا موہ تروڑ گیا، جگ ماؤ ناں چھوڑ گیا

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھنی آ چھم کر کے

بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا جکواں نے کھب کالے، نوکر بچڑے پیار حوالے

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھی آ چھم کر کے

.بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا سراں نے اپر خطرے، خیریں منے اساں بکرے،

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھی آ چھم کر کے

.بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا ولیاں تے ترے پیٹھے، خیریں آون مینڈے بیٹے

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھی آ چھم کر کے

.بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا آ وڑ مینڈھے ویڑھے۔ ونڈاں پئی لڈو پیڑے

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھی آ چھم کر کے

.بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا بچیا خیریں آ، بھیناں کو ملن بھرا

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھی آ چھم کر کے

.بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے

شالا گڈی خالی چک جھمرہ، بچڑے مانن وڈیاں عمراں

گڈی سرکاری، پلاں تو لنگھی آ چھم کر کے

.بچڑے ماواں نے، گھنی وینی آ بند کر کے[۱۶]

جلیانوالہ باغ کا سانحہ

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کا دن اس برصغیر کی تاریخ میں بہت زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ وہی دن ہے جب جلیانوالہ باغ

امرتسر میں ایک فرعون مزاج انگریز گورنر سر مائیکل اوڈوائر کے حکم سے ایک انگریز جنرل ڈائر نے باغ میں جمع ہزاروں مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو مشین گنوں کی گولیوں سے بھون کر رکھ دیا۔ جلیانوالہ باغ میں ہر طرف خون انسانی کے چھینٹے اڑتے نظر آئے۔

بیساکھی کے تہوار پر جمع ہزاروں دیہاتی جلسہ سننے کے لئے جلیانوالہ باغ میں پہنچے تھے۔ کرسی صدارت پر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کی جگہ ان کی تصویر جلسہ کی صدارت کے فرائض ادا کر رہی تھی۔ جلیانوالہ باغ میں انگریز کی عہد شکنی اور رولٹ ایکٹ کے نفاذ کی وجہ سے اس برصغیر کے باشندوں کے قلوب میں برطانوی حکومت کے خلاف نفرت و حقارت کے شدید جذبات ابھر آئے تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال نے امرتسر میں رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کی قیادت کی تھی۔

رولٹ ایکٹ کیا تھا؟ حالت جنگ میں ملے ہوئے ہنگامی اختیارات کی وجہ سے حکومت اگرچہ بغاوت پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن جنگ کے بعد آئندہ کسی ایسی بغاوت سے نمٹنے کی پریشانی نے انہیں ایسی قانون سازی کرنے پر مجبور کیا جس سے وہی فوائد حاصل کرنا مقصود تھے جو ہنگامی اختیارات سے حاصل ہوئے تھے۔ چنانچہ جنگ کے خاتمے سے قبل ہی گورنمنٹ آف انڈیا کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی گئی جو نہ صرف جو بغاوتی سرگرمیوں کی رپورٹ پیش کرے بلکہ مستقبل میں ایسی صورت حال سے نپٹنے کے لئے قانونی اور انتظامی سفارشات بھی مرتب کرے۔ جسٹس ایس۔ اے۔ ٹی رولٹ کو اس کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا اور اس کی مرتب کردہ یہ رپورٹ ۲۱ مارچ ۱۹۱۹ء کو منظور کئے جانے والے رولٹ قوانین کی بنیاد بنی۔ ان قوانین کی رو سے حکومت کو یہ حق ملتا تھا کہ ان افراد کو، جن پر تخریب کاری میں ملوث ہونے کا مبینہ شک موجود تھا، سیکورٹی کی یقین دہانی کروانے کے لئے کہہ سکتی تھی یا انہیں کسی مخصوص علاقے تک محدود کر سکتی تھی یا پھر انہیں جیل بھی بھجوا سکتی تھی۔[۱۷]

زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد نے رولٹ ایکٹ کی منظوری کے خلاف مزاحمت کی۔ صحافی، وکلا، تدریس سے وابستہ افراد اور شاعروں ادیبوں نے اس بل کی شدید مخالفت کی۔ کئی پنجابی شاعروں نے اس کے خلاف نظمیں لکھیں جن میں بابو فیروز دین شرف اور نانک سنگھ پیش پیش تھے۔ ان کی جو نظمیں بحق سرکار ضبط کر لی گئیں،

ان میں نانک سنگھ کی دو نظمیں ہمیں دستیاب ہو سکی ہیں۔ انہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور کے پنجابی شاعر' معاشرے کا سب سے حساس عنصر تھے۔

سارے ہند نے کیہا اک جان ہو کے
رولٹ بل نوں نہ منظور کرنا
اساں واریا سبھ کجھ تساں اتوں
ساڈا پیار نہ دل تھیں دور کرنا
لکھاں سورمے جنگ کہا دتے
ہائے کجھ تاں خیال ضرور کرنا
ساڈے قابل رحم اس حال اتے
رب دے واسطے ترس ضرور کرنا[۱۸]

اسی طرح دوسری نظم میں کہا گیا تھا:

ساڈی روندیاں واسطے پاوندیاں دی
ہائے سنی نہ کسے فریاد لوکو!
دھکو دھکی چ بل نوں پاس کیتا
ساڈے کیرنے کس نوں یاد لوکو!
اسیں رہے "حضور حضور" کردے
پر حضور بڑے استاد لوکو!
ہائے بنھ کے نویں قانون اندر
پیڑ سٹیا وانگ کماد لوکو![۱۹]

۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو بیساکھی کے روز جلیانوالہ باغ کے احتجاجی جلسہ پر جنرل ڈائر نے انگریز سپاہیوں کے کئی دستوں

کے ساتھ دھاوا بول دیا۔ جلیانوالہ باغ کو فوج نے چاروں اطراف سے گھیر لیا اور بغیر کسی انتباہ کے پرامن عوام پر اندھا دھند گولیاں برسانی شروع کر دیں۔ نوجوان گولیاں کھا کھا کر گرتے تھے اور ان کی جگہ اور نوجوان آ کھڑے ہوتے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے جلیانوالہ باغ میں خون انسانی کی ندیاں بہنے لگیں۔ زخمی تڑپتے اور کراہتے ہوئے نظر آنے لگے۔ جو لوگ اس خوفناک آتش بازی میں جان بچانے کے لئے بھاگے وہ جلیانوالہ باغ کے کنوئیں میں گر کر جاں بحق تسلیم ہو گئے جلیانوالہ باغ میں ہر طرف لاشیں بکھری ہوئی تھیں اور کنواں لاشوں سے اٹ گیا تھا۔ ڈائر نے جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا۔ اس کی وجہ سے ایک بار پھر میجر ہڈسن (جس نے مغل شہزادوں کے سر کاٹ کر ان کا چلو بھر خون پیا تھا اور ان شہزادوں کے سروں کو طشت میں لگا کر ہندوستان کے آخری مغل شہنشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا) اور کرنیل نیل (یہ وہ انسان نما درندہ تھا جس نے مسلم خواتین کو برہنہ کر کے ان کے لواحقین کو ان سے برا بھلا کہنے پر مجبور کیا تھا۔ لیکن جب ان مجاہدوں نے انکار کیا تو انہیں قتل کر دیا گیا۔ اور ان شریف زادیوں کو درندہ صفت گوروں کے حوالے کر دیا تھا) کی یاد کو تازہ کر دیا تھا۔

امرتسر کے عوام پر ایک قیامت گزر گئی۔ امرتسر کے معززین کو پیٹ کے بل چلایا گیا۔ انہیں برسرعام بازاروں اور چوکوں میں ٹکٹکی سے باندھ کر برہنہ کر کے بید لگائے گئے۔ گوروں نے گھروں میں گھس کر خواتین کی بے عزتی کی۔ نوجوانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ بوڑھوں کو بے عزت کیا گیا۔ خواتین کو رسوا کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی۔ جلیانوالہ باغ کی قتل گاہ نے پورے برصغیر کو لرزا دیا۔ پورے برصغیر میں جلسوں' مظاہروں اور جلوسوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ لاہور میں طلباء اور عوام نے مل کر جلوس نکالا اور جب یہ جلوس ہیرا منڈی میں نوگزے کی خانقاہ کے قریب پہنچا تو سر عمر حیات خاں ٹوانہ اور نواب محمد علی قزلباش نے اہل جلوس پر گولی چلا دی جس سے ایک نوجوان طالب علم ہری رام ہلاک ہوا اور متعدد ہندو اور مسلمان زخمی ہوئے۔ لاہور میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔ مسلمان نوجوانوں میں مسٹر چنن الدین' میاں فیروز الدین احمد کو ڈنڈا فوج بنانے کے سلسلہ میں گرفتار کر لیا گیا۔ لالہ لال چند فلک' مہتہ جی' لالہ پنڈی داس اور بعض دوسرے لیڈروں کو مارشل لاء کے تحت گرفتار کر کے بیس بیس سال قید کی سزا دی گئی۔ گوجرانوالہ میں لوگوں نے مشتعل ہو کر ریلوے اسٹیشن کو نذر آتش کر دیا۔ اس سلسلہ میں حکومت نے شیخ عطاء محمد'

شیخ دین محمد (جو بعد میں لاہور ہائی کورٹ میں جسٹس رہے تھے)' ملک لال خاں اور بعض دوسرے لیڈروں کو گرفتار کر لیا۔ پورے پنجاب میں پکڑ دھکڑ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ پورے صوبہ کے بڑے بڑے شہروں میں حالات پر قابو پانے کے لئے مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور مارشل لاء کے تحت عوام کو انتہائی بہیمانہ سزائیں دی گئیں۔

ایک غیر معروف شاعر کی پنجابی نظم جلیانوالہ باغ کے سانحہ کی جو تصویر پیش کرتی ہے اس سے بیان کردہ واقعات کی تصدیق ہو جاتی ہے:

ہوم رول دے حامی دتے جیلاں نوں ٹور — سینہ پال کچلو ویر وے میرے دکھڑے نہ پھول
رام نومی جو آئی' مسلمان ہندو نیں بھائی — کچلو دی جے منائی وجے واجے تے ڈھول
دن دوجا چڑھیا' کچلو حاکماں پھڑیا — سینہ پال نوں اڑیا' پھڑ کے لے گئے انبھول
سن کے گئیاں نیں جاناں' ہندو تے مسلماناں — کر کے بند دوکاناں چلے ڈی سی دے کول
خلقت پل اتے آئی ڈکے گورے سپاہی — ایتھاں گولی چلائی مارے کئی انبھول
لوکاں طیش جو آیا نیشنل بنک جلایا — لٹیا ہتھ جو آیا بوہے بنکاں دے کھول
جنرل ڈائر جو آیا فوجاں نال لے آیا — اوہنے فائر کرایا' مارے گئے انبھول[20]

ایک اور پنجابی شاعر حکیم عبداللطیف نے اپنی نظم میں فائرنگ اور فائرنگ کے نتیجے زمین کے بل رینگنے کے حکم کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا:

جلیانوالے دا باغ سی لال ہویا انھے واہ جدوں گولیاں آیاں نیں
ڈھڈاں بھار چلاؤندے خلق تائیں ویکھ ظالماں پٹھیاں چایاں نیں
ایہدر و یکھیا رب دے بندیاں نے ایہناں حاکماں تے اتاں چایاں نیں
اوہدر گولیاں نبیؐ دے پاک روضے اتے ظالماں جا برسایاں نیں
بھرے جیل خانے کھچا کھچ پورے ظفر علی نوں لکھ ودھائیاں نیں
جس پنجاب اندر زمیندار بن کے سہے سنگتاں جھون جگایاں نیں[21]

نانک سنگھ کی نظم "خونی وساکھی" میں اس سانحہ کا ذکر یوں ملتا ہے :

نونہال کئی جڑاں توں پٹ سٹے
جیہیاں سخت ہنیریاں چھٹیاں سن
ایہہ اوہ باغ ہے جیہدے وچ ہائے ہائے
مدن موہن جیہیاں کلیاں ٹٹیاں سن
رتن دئی نے لال نورتن بدلے
بہہ کے رات دن میڈھیاں پٹیاں سن
کئیاں نتھاں دے لال گواچ گئے سن
گئیاں کئی سہاگناں لٹیاں سن[۲۲]

بابو فیروز دین شرف اپنی ایک نظم میں جلیانوالہ باغ کے سانحہ کو نادر گردی کے مظالم سے تشبیہ دیتے ہیں :

نادر گردی وی ہند نوں بھل گئی اے
چلے انگلشی ایسے طوفان اتھے
کراں کیہڑیاں اکھاں دے وچ ظاہر
جو جو ظلم دے ہوئے سامان اتھے[۲۳]

بابو شرف کی ایک اور نظم جلیانوالہ باغ کے سانحہ کو نہایت موثر انداز میں پیش کرتی ہے :

ایہہ اج روح شہیداں دی آکھدے نیں
ڈائر کیتیاں اتھے للجیاں سن
اتھے وانگ کبوتراں تڑفدے ساں
سانوں ایس تھاں گولیاں وجیاں سن
لیراں لیراں سی ہستی دا ہویا جامہ

لڑفاں لتھیاں' اڈیاں دھجیاں سن

رلدے رہے ساں رات بھر کفن باجھوں

لاشاں کسے نہیں لاشاں لجیاں سن[۲۴]

شاعر کے اس بیان کو ایک جدید مصنف سوسن ان لفظوں میں بیان کرتا ہے کہ رات دس بجے ڈائر نے فوجیوں کے ہمراہ سارے شہر کا گشت کیا شہر بالکل خاموش تھا اور کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔ صرف وہی لوگ گھروں کے دروازوں سے باہر تھے جو باغ میں پڑے سسک رہے تھے اور چونکہ ڈائر اپنے گشت میں اس علاقے سے نہیں گزرا اس لئے اسے ان کی چیخیں بھی سنائی نہ دے سکیں۔

شرف کی ایک اور نظم ہے:

کتے تسبیحاں' کتے جیبو ٹٹے

رلے مٹی وچ کنگھے کرپان اٹھے

بھارت ماتا دے سچے سپوت پیارے

قوم واسطے ہو گئے قربان اٹھے[۲۵]

ہمارے عہد کا مصنف سونسن لکھتا ہے:

"وسط کی طرف لاشیں اکیلی اکیلی یا گروپس کی شکل میں پڑی ہوئی تھیں اور ان کے درمیان جگہ جگہ قالین، گھڑیاں، قلم، ستے زیورات، پانسے، تاش، بٹوے اور زیورات بکھرے ہوئے تھے۔ یہ سب کچھ غروب آفتاب سے صرف چھ منٹ قبل ہوا۔"

حوالے

۱۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۶۱

۲۔ وی این دت، جلیانوالہ باغ، پٹیالہ، در احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحات ۶۱، ۶۲

3- War Services of D.G. Khan, Lahore, 1918.

4- War Services of Shahpur District, Lahore, 1918.

5- Ibid.

6- Bombay Chronicle, 27 November, 1923.

۷۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۶۵

8- Bombay Chronicle, 27 November, 1923.

۹۔ وی این دت، جلیانوالہ، در احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحات ۶۶۔۶۷

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۶۷

۱۱۔ انٹرویو غلام سکینہ، عمر ۶۰ سال، پنڈ دادنخان، ضلع جہلم، در احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۶۸

۱۲۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۶۸

13- Daily "Nation" Lahore, 18 November, 1923

۱۴۔ نانک سنگھ، خونی وساکھی

۱۵۔ انٹرویو غلام سکینہ، در احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحات ۷۶۔۷۷

۱۶۔ ایضاً، صفحات ۷۷۔۷۸

۱۷۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۸۲

۱۸۔ نانک سنگھ، خونی وساکھی، صفحہ ۴

۱۹۔ ایضاً، صفحہ ۵

20- Shafqat Tanveer Mirza, Resistence in Punjabi Poetry, Lahore, p.122

21- Ibid., p.125

۲۲۔ شرف رچناولی (بھاگ دوجا)، پٹیالہ، ۱۹۷۲ء، صفحہ ۲۵۶

۲۳۔ ایضاً، صفحہ ۲۷۰

۲۴۔ ایضاً، صفحہ ۲۶۶

۲۵۔ ایضاً۔

ساتواں باب

ہجرت سے خاکسار تک

تحریک آزادی کا عبوری دور

۱۹۲۰۔۱۹۴۰ء

جلیانوالہ باغ کے قتل عام نے پنجاب کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آزادی کی تڑپ میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ سیاسی بیداری کی ایک عظیم لہر نے اہل پنجاب کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ برطانوی راج کے لئے وفاداری کے جذبات کمزور پڑنے لگے اور مراعات یافتہ جاگیردار اور نو دولتئے طبقوں کو چھوڑ کر مستریوں اور کاریگروں سے لے کر بابوؤں اور دکانداروں کے طبقے تک غیر ملکی راج کے لئے نفرت کے جذبات دلوں میں پلنے لگے۔ جلیانوالہ کا قتل عام بدیسی حاکموں کے خلاف نئی بغاوتوں کا نقطۂ آغاز بن گیا۔ سیالکوٹ شہر کے مقامی شاعر دیوی دیال آچاریہ کی ایک نظم "دعائے خیر" گہرے طنز اور جذبے کی شدت کی مظہر ہے:

جگاں تیک تیرا ڈائر بھلا ہووے اوپر اساندے کرم کمایا ای
ستے پئے چروکنے وچہ غفلت سانوں گولیاں نال جگایا ای
تھوڑی گل توں جھگڑیاں وچ اپنے سراں دھڑاں دے ویر پئے جاوندے سن
سانوں رستہ محبت دا یاد نہیں سی جنویں بھلیاں نوں راہ پائیا ای
اپنے ملک دی دلے وچ قدر نہیں سی سدا گیت ودیش دے گاوندے ساں
پوجا غیر دی سجن چھڈا سا تھیں واہ وا بھگت سودیش بنایا ای
گولی کھاوَنی تے رہی اک پاسے سن کے نام بندوق دا کبدے ساں

بھلا ہووی درگاہ دا خوشی وسیں ساڈا موت دا خوف ہٹایا ای
کدوں عدم تعاون ساں کرن جوگے اچی کوندیاں دا ساہ سکدا سی
ایہہ تیری عنایت اے سچ جانی اساں عاجز اندا دل ودہایا ای
بھولے بھالے سوراجیہ کی جاندے ساں برٹش راج ہی نعمت سی سمجھی دا
تیری نیکی ویال نہ جائے دلی سانوں حق ناحق سجھایا ای[1]

آزادی کا یہ عبوری دور (۱۹۲۰ـ۱۹۴۰ء) پنجاب بلکہ پورے ہندوستان میں تحریک آزادی کے تسلسل کا دور ہے۔ ۱۹۲۰ء کی پہلی نصف دہائی ترک موالات، ہجرت اور خلافت کی تحریکوں سے عبارت ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اکالی اور ببر اکالی تحریکیں، کمیونسٹ پارٹی، کرتی کسان لہر اپنے نمایاں رنگوں کے ساتھ ابھرتی دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری نصف دہائی بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی انقلابی کارروائیوں (۱۹۲۵ـ۱۹۳۱) پشاور۔ تاشقند بالشویک مقدموں (۱۹۲۲ تا ۱۹۲۷ء)، کانپور سازش مقدمہ (۱۹۲۵ء) اور میرٹھ سازش مقدمہ (۱۹۲۹ـ۱۹۳۳ء) کے ہنگامہ خیز واقعات سے عبارت ہے۔ ۱۹۳۰ء کی پوری دہائی کسان تحریک، احرار، خاکسار اور مسلم بے چینی کے دیگر سیاسی مظاہر سے بھری پڑی ہے۔ پھر دوسری عالمی جنگ، خاکساروں کا قتل عام، قرارداد لاہور اور اسی مہینے لندن میں پنجاب کے سابق لیفٹیننٹ گورنر سر مائیکل اوڈائر کا قتل چوتھی دہائی کے اہم واقعات ہیں۔ یہ تمام واقعات ہماری قومی تاریخ کا حصہ ہیں اور ان کے بارے میں اس کثرت سے لکھا گیا ہے کہ انہیں دہرائے بغیر یا ان کا مختصراً ذکر کر کے ہم اپنی بات کا مفہوم واضح کر سکتے ہیں۔ یہ دور پنجابی شاعری کے قومی کردار کا انتہائی اہم دور ہے جو علامہ اقبال کے زیر سایہ دو قومی نظریہ کے تشخص کو اجاگر کر رہا ہے۔

ہجرت، خلافت اور ترک موالات

پانچ فروری ۱۹۱۵ء کو لاہور کے پندرہ مسلمان طالب علموں نے اپنا ملک چھوڑ کے ترکوں کی مدد کے لئے ترکی جانے کا فیصلہ کیا کہ یہ ملک اس وقت انگریزوں کے خلاف جنگ میں مصروف تھا۔ یہ نوجوان جہاد کے شوق سے

سرشار ہو کر لاہور سے کابل پہنچے جہاں چار سال تک نظر بند رہے۔ ان میں سے کچھ ترکی جاتے ہوئے راستے میں تاشقند رک گئے۔ یہاں انہوں نے ۱۹۲۰ء میں ہندوستان کی پہلی کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد رکھی۔ ایک طالب علم دوران سفر بیمار ہو گیا اور افغانستان میں مناسب علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے فوت ہو گیا۔ ایک آزاد علاقے میں مولویوں کے ہاتھوں قتل ہوا' تیسرا وطن واپس آنے کے بعد انگریز کی جیل میں راہی ملک عدم ہو گیا۔ ان میں سے ایک نے جو بہت سی مشکلات اور تکالیف کا سامنا کرتا ہوا ترکی پہنچا ترک توپ خانے کی ملازمت اختیار کی اور کپتان کے عہدے پر پہنچ کر ریٹائر ہوا۔ اس نے جس طرح ساری جوانی ترکی میں گزار دی تھی بڑھاپا بھی وہیں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ لاہور کے ان طالب علموں کی قربانی کو ملک گیر شہرت حاصل ہوئی۔ ۱۹۲۰ء میں جب علماء نے ہجرت کا اعلان کیا تو اور بھی بہت سے ہندوستانی اور پنجابی لڑکے کابل کے راستے ترکی جانے کی خواہش لئے چل دیئے۔[۲]

۱۹۲۰ء میں امیر حبیب اللہ قتل کر دیا گیا اور امان اللہ خان کابل کے تخت پر بیٹھا۔ جب ہندوستان کے علماء نے مسلمانوں کو ہجرت کر کے افغانستان جانے کی ہدایت کی تو امان اللہ خان نے مہاجرین کا استقبال کرنے کا اعلان کیا۔ یہ اعلان بھی بغیر کسی منصوبہ بندی کے جذباتی انداز میں کیا گیا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کا انجام کیا ہو گا۔ ہندوستان رولٹ ایکٹ اور جلیانوالہ باغ کی فائرنگ کے نتیجے میں انگریز دشمنی کی آگ میں سلگ رہا تھا۔ ہجرت کا اعلان ہوتے ہی لوگوں کا سیلاب افغانستان کو چل دیا۔ انہوں نے اپنی املاک اونے پونے داموں فروخت کر دیں۔ کاروبار چھوڑ چھاڑ کر مولویوں کا کہنا مان کر افغانستان کی طرف منہ اٹھا کے روانہ ہو گئے۔ پچاس ہزار سے ایک لاکھ کے قریب لوگ جن میں پنجاب' سرحد اور سندھ کے لوگوں کی تعداد زیادہ تھی افغانستان میں داخل ہو گئے۔ افغانستان میں ان کے قیام و طعام کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا وہ بہت ذلیل و خوار ہوئے' جمع پونجی ختم ہو گئی۔ کچھ لوگ تو دو ماہ کے بعد مایوس ہو کر واپس وطن پلٹ آئے اور کچھ وہیں مرکھپ گئے۔ ان میں سے کچھ ایسے پختہ عزم بھی تھے کہ انگریزوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کے لئے آگے روانہ ہو گئے۔[۳]

جنگ کے اختتام پر جب برطانیہ کو فتح حاصل ہو گئی تو اس نے ترکی خلافت کے علاقوں کو تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ اس پر برصغیر کے مسلمانوں کو تشویش لاحق ہوئی کہ ترکی کے ٹکڑے کرنے کے علاوہ ان کے متبرک مقامات کو

نقصانات نہ پہنچایا جائے۔ چنانچہ ان کے تحفظ کے لئے مسلمانوں نے کانگرس سے مل کر ۱۹۱۹ء میں تحریک خلافت شروع کر دی۔ اس دوران ولائتی مال کا بائیکاٹ کیا گیا اور انگریزوں کے خلاف مظاہرے کئے گئے۔ شروع شروع میں بار کے علاقے میں اس تحریک کے حوالے سے کوئی سرگرمی نظر نہ آئی مگر بعد میں جب مولانا محمد علی جوہر کی والدہ بی اماں پنجاب کے دورے کے دوران چنیوٹ پہنچیں اور وہاں مولانا ذاکر حسین (جامع محمدی شریف) نے تحریک کے سلسلے میں مظاہروں کا آغاز کیا۔ تو ان کے اثرات یہاں بھی پہنچے چنانچہ جلالپور اور پنڈی بھٹیاں میں بھی اس تحریک کی حمایت میں فضا ہموار ہوئی اور مقامی طور پر یہ گیت بڑا مشہور ہوا۔

ہن گیت وطن دے گاواں گے
کھدر آپ ہنڈاواں گے
غازی مصطفیٰ کمال پاشا وے
آ کے ویکھ سمرنا دا حال وے
تیریاں دور بلائیاں
بیوہ ہو گئی آں مائیاں

انگریزی مال کے بائیکاٹ کی وجہ سے بار کے علاقے کے ہر گھر میں چرخہ رواج پا گیا تھا اور اس سے مقامی صنعت کو بڑا فروغ حاصل ہوا تھا۔[۴]

ان دنوں اس طرح کی نظمیں عام تھیں:

انور غازیا! جلدی آ وے تیرے نام توں ہند فدا وے
سانوں بن ہے ڈاہڈی بھیڑ وے آویں کوہ ہمالیہ چیر وے
عربی گھوڑیاں ترت دوڑا وے انور غازیا جلدی آ وے[۵]

آویں غازی مصطفےٰ کمال وے　　دیویں ہند نوں پاک جمال وے
بیکس ٹرکی دے سپہ سالار وے　　کدی ہند ول موڑ مہار وے
ویکھیں ساڈا وی آن کے حال وے　　آویں مصطفےٰ غازی کمال وے[۶]

اسی طرح اس دور کی شاعری کا بڑا حصہ مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی اور ان کی والدہ بی اماں کے ذکر سے بھرا ہوا ہے۔

محمد علی بانکیا ویرا
شالا ہون خیراں، صدقے تیریاں سن میریاں
شوکت علی سوہنیا ویرا
اے درداں والی میں، درداں گھریاں سن میریاں
محمد علی بانکیا ویرا
جوڑی تساڈی واہ وا مولے رلائی اے
جو گل پائی تساں، کسے بھی نہ پائی اے
دتیاں کل ہند نوں آ کے تسائیں دلیریاں وے ویرا دلیریاں
لکھ لکھ رحمت اس نوں، جائے جس ماتا دے
تساں بھی پیاریا خوب حق پچھاتا وے
حکم مائی دا، حکم رب کر جاتا وے
منیاں جو کیہا اس نے، اکھیاں نہ پھیریاں، وے نہ پھیریاں
محمد علی بانکیا ویرا[۷]

ترک موالات کے حوالے سے متعدد پنجابی نظمیں چھپ کر سامنے آئیں اور انتہائی مقبول ہو گئیں۔ شاعروں نے ترک موالات کو قرآن کا فرمان قرار دیا۔

ترک موالات فرمان قرآن دا اے، کیوں ڈان لگے مسلمان اس تھیں
ایہہ دتا حکم خدا رسول سانوں، کیوں ہوندے جے اج حیراں اس تھیں
ویکھو ذرا جا قرآن حدیث اندر، مل جائے گا سب بیان اس تھیں
کیوں غدر کر کے بہانیاں نال ٹالو، رکھو یاد نہ رہے ایمان اس تھیں
چٹے منہ نوں ویکھ نہ بھل جائیو، پورے ہون نہ عہد پیمان اس تھیں
خلافت گئی اسلامیہ اج کتھے، بے دخل کیتا سلطان اس تھیں
خادم قول دے پھڑپھڑ ظالماں نے، دتے بھر ویکھو زنداں اس تھیں[۸]

انگریزی مال کے بائیکاٹ اور ہندوستان کی صنعت کو تباہ کر کے لنکا شائر اور مانچسٹر کے کپڑے کی صنعت کو فروغ دینے کے حوالے بھی اس دور کی نظموں میں عام ملتے ہیں۔ بابو فیروز دین شرف کی مندرجہ ذیل نظم اس دور میں گھر گھر گائی جاتی تھی:

گھر گھر چرخیاں دی کرو رسم جاری
جے کر صاحبو! تساں نہیں ننگ ہونا
کفن لئی محتاج ہاں دوجیاں دے
ایدوں ودھ کیہ ہونا ہے ننگ ہونا
گھوکر پہنچدی جب ساڈیاں چرخیاں دی
گردش بیٹھ ہے اہل فرنگ ہونا
ڈٹھا سوت جد ساڈا برطانیہ نے
پونی وانگ ہے اوس دا رنگ ہونا

مانچسٹر دے مان وی ٹٹ جاسن
لنکا شائر وی نال برباد ہووے

کرو ہندیو! رل کے کم ایسا

ساڈی مادر وطن آزاد ہووے[9]

اسی دور میں فوج اور پولیس کی نوکری کو حرام قرار دینے کی تحریک بھی چلی۔ اس تحریک کا اظہار کئی پنجابی نظموں اور قصوں میں ہوتا ہے۔ سیالکوٹ کے حافظ عبدالحق کی مندرجہ ذیل نظم نے اس دور میں کافی شہرت پائی تھی:

کیتی قوم دی آپ تباہی آ پلس فوج دے نوکر سپاہی آ
حرام نوکری ظالم دی آہی آ

چند پیسیاں خاطر شیطان نوں دیویں دین تے دھرم ایمان نوں
نالے جان بھی اپنی گوائی آ پلس فوج دے نوکر سپاہی آ
حرام نوکری ظالم دی آہی آ

پھر ہندو، مسلمانوں اور سکھوں پر الگ الگ انگریزی مظالم اور گرفتاریوں کا ذکر کرنے کے بعد شاعر یوں تلقین کرتا ہے

سنو فوج تے پلس دے بھائیو! ہن وطن تے رحم کمائیو!
دیندی قوم پئی اج دہائی آ پلس فوج دے نوکر سپاہی آ
حرام نوکری ظالم دی آہی آ

لعنت نوکری دی ایہہ چھڈ توں جھولی غیر اگے نہ اڈ توں
منگ رب تھیں، جیندی خدائی آ پلس فوج دے نوکر سپاہی آ
حرام نوکری ظالم دی آہی آ

دتا فتویٰ ایہہ ہند دے عالماں سمجھیں اجے وی توں نہ ظالماں
حرام نوکری پلس بتائی آ پلس فوج دے نوکر سپاہی آ
حرام نوکری ظالم دی آہی آ[10]

خلافت، عدم تعاون، ترک موالات کے حوالے سے بہت سا کلام آج بھی تحقیق اور تجزیئے کا منتظر ہے۔ اس دور میں ترکی کے حق میں اور یونانیوں کے خلاف عوامی سطح پر خاصا پنجابی ادب وجود میں آیا اس لئے کہ اس تحریک میں بچہ بچہ حصہ لے رہا تھا ایک عام آدمی سے لے کر تجارت پیشہ کاروباری افراد تک حتیٰ کہ دیوبند اور ندوۃ العلماء کے عالم تک اس میں حصہ لے رہے تھے اور اپنے حجروں سے باہر آ گئے تھے سب لوگ سر سے پاؤں تک صدائے احتجاج بن گئے تھے اس وقت ترکی کے ہیرو غازی مصطفیٰ کمال پاشا اور انور پاشا پنجاب کے بھی ہیرو بن چکے تھے سمرنا کے لوگوں پر ہونے والا ظلم ہند باسی اپنے اوپر ہونے والا ظلم محسوس کر رہے تھے جن پنجابی شعراء کے نام اس حوالے سے مشہور ہوئے ان میں منشی محمد اسماعیل (قصہ غازی مصطفیٰ پاشا کمال دی فوج) احمد اللہ بیگ (قصہ ترکاں دی بیداری تے یونان دی زاری) حافظ عالم خان (قصہ چھٹی خلافت حصہ اول) ملک لال دین قیصر، عبدالرحیم عاجز حافظ عبدالحق سیالکوٹی وغیرہ۔ ملک لال دین قیصر (۱۸۱۹ء-۱۹۵۶ء) نے عملی طور پر بھی تحریک خلافت میں حصہ لیا اور نو بار جیل گئے۔ ان کے لکھے ہوئے یہ بول آج بھی لوگوں کو زبانی یاد ہیں ملاحظہ ہوں۔

غازی مصطفیٰ پاشا کمال وے تیریاں دور بلائیں
ڈالیوں ٹٹ پئے کچے گچھے
وات یتیماں دی کوئی نہ پچھے
روندے سمرنا دے بال وے
بیوہ ہو گیاں مائیاں
کر بکرے یونانی حلال وے
بیبا وانگ قصائیاں
غازی مصطفیٰ پاشا کمال وے تیریاں دور بلائیاں[1]

ملک لال دین قیصر کی ایک اور کتاب "جھوک انور دی" انہی کی دکان قیصر بکڈپو سے شائع ہوئی جس میں لوک گیت جھوک کی طرز پر ترکی مسلمانوں کے دکھوں پر آنسو بہائے گئے ہیں اور غازی کمال کی شان کو بڑھانے کی دعا کی

گئی ہے:

جھوک میرے انور والی غازی کمال وے
رب ودھا دے تیرا دونا اقبال وے
توشہ انگورا دا سنیاں موصل تے جا رہیا
مدتاں دی اجڑی ہوئی بستی بسا رہیا
جھوک میرے انور والی

مصطفیٰ پاشا جے توں موصل تے جا رہیوں
بھیج دے انور سانوں بلخ بخاریو
جھوک میرے انور والی[۱۲]

ایک جگہ تحریک خلافت کے رہنما مولانا شوکت علی کے بارے میں لکھتے ہیں:

رگ رگ دے کھوہاں تیری اچی نسار وے
ہند دیاں فوجاں میرا شوکت سالار وے
جھوک میرے انور والی

اسی دور میں پیر جماعت علی شاہ ثانی کے ایک مرید حافظ عالم خاں کی کتاب "چٹھی خلافت دی" (حصہ اول) بھی قابل ذکر ہے جس میں وہ کہتے ہیں:

پڑھ چٹھی خلافت دی آئی آ
گاندھی جی نے لکھ پو چائی آ

اس میں وہ کہتے ہیں کہ انگریز کے دلالوں نے ڈائریاں لکھ کر بھائیوں کو قید کروا دیا ہے اور دین کی تباہی کا سامان بنے ہیں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تحریک خلافت کے ممبران میں نام لکھوانے میں تمہاری بھلائی ہے۔ ایک جگہ علی برادران (مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی) کے بارے میں لکھتے ہیں:

سچ علی برادر فرماوندے سچے سوٹ نہ جیہڑے ہنڈاوندے
اوہو دین ایمان بچاوندے واہ واہ اوہناں تے فضل الٰہی آ
پڑھ چٹھی خلافت دی آئی آ[۱۳]

ترک موالات کے حوالے سے حافظ عبدالحق کی ایک اور نظم قابل ذکر ہے:

ترک موالات آلات ایہہ ہے ایسا اس تھیں کھاجا سی دشمن ہار آج کل
دسیا رفیق طریق ایسا نہ مل وانگے دا ہتھیار اج کل
پاون عدم تعاون کر ہندی فتح وچ میدان اغیار اج کل
اللہ چاہے ہندی پائے فتح اس تھیں دشمن ہووے جلد فرار اج کل
(قومی لہراں، غزل ۱۱)

ہندو مسلم سکھ اتحاد کر گئے باقی رہیا نہ ہن فساد کوئی
ہندی خود ای ہند آزاد کر سن ساڈی کرے نہ چاہے امداد کوئی[۱۴]
(قومی لہراں، غزل ۷)

اکالی اور ببر اکالی تحریکوں کے معرکے بھی اس دور میں سر ہوئے۔ لیکن چونکہ یہ خالص سکھ تشخص کی تحریکیں تھیں اور پنجاب کی تحریک آزادی کے مجموعی کردار کا اظہار نہیں کرتی تھیں اس لئے ہم ان کے سرسری ذکر کے بعد بھگت سنگھ اور ان کے ساتھیوں کی تحریک کی بات کریں گے لیکن اسی دوران مسلم تشخص کے حوالے سے مسلمانوں کو جو ذہنی اور روحانی دھچکے برداشت کرنے پڑ رہے تھے اور پنجابی شاعروں نے جس طرح ان پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا، پہلے ہم ان کے بارے میں بات کریں گے۔ خصوصاً غازی علم دین شہید کا واقعہ۔

ایک ہندو راجپال نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے ایک کتاب شائع کی جس پر غازی علم دین شہید نے اس کو قتل کر دیا علم دین پر مقدمہ چلایا گیا اور اس کو ۳۱ اکتوبر ۱۹۲۹ء کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ اس عاشق رسولؐ نے مسلمانوں میں عشق رسولؐ کی ایک نوری لاٹ کو روشن کر دیا پنجابی ادب میں علم دین شہید

کے بارے میں لکھے ہوئے قصوں کا جیسے سیلاب آگیا، عشق لہر کا ایک غیر مطبوعہ چو مصرعہ ملاحظہ فرمائیں۔

ہویا چودھویں دے وچ روشن تیرا عشق اوئے عاشق حضورؐ دیا
جھونٹا واردی پینگھ دا جھوٹیا ای شوق نال ساتھی منصور دیا
سب دی اکھیاں وچ سما گیا ایں علم دین او ذریا طور دیا
عشق لہر دی عرض دربار اندر پہلوں کریں مسافرا دور دیا[۵]

محمد رفیع اختر لاہوری کا جو آٹھ مصرعہ کا بیت ملا ہے اس میں شاعر نے علم کے پختہ ایمان کا اظہار کیا ہے یہ بات اس وقت بہت مشہور ہوئی تھی کہ علم دین کے وکلاء نے اس کو قتل سے انکار کرنے کی تجویز پیش کی جس کو علم دین شہید نے سختی سے رد کر دیا تھا اختر لاہوری کا بیت ملاحظہ فرمائیں:

دشمن پیدا رسول دا ہو گیا اے میرا دل ڈاہڈا شرمسار کیتا
راجپال لعین نوں قتل کر کے علم دین نے نہیں انکار کیتا
جا کے وچ عدالت دے وانگ مرداں میں ہی ماریا اے صاف اقرار کیتا
دشمن پاک رسولؐ دا مار کے تے نبی پاکؐ دا میں دیدار کیتا
ایہہ دنیا کیہ عقبیٰ سوار لئی اے پیدا دوئیں جہانیں وقار کیتا
صدقے پاک رسولؐ توں جان کیتی جھوٹے دم نہیں اعتبار کیتا
دنیا والیو نہ جھٹلاؤ مینوں میں ای ایس لعین تے وار کیتا
اللہ اوسنوں کرے پیار اختر جنہے نبی دے نال پیار کیتا

مولانا محمد بخش مسلم نے بے قابو مسلمانوں سے سر شفیع کے کہنے پر خطاب کیا قرآن پاک کی تلاوت کے بعد صبر کی تلقین کی اور اپنے مندرجہ ذیل شعر پڑھے:

جیوندی جان اوہ پیاریا علم دنیا جیون جوگیا موت نوں ماریا ای
جگاں تیک رہسی تیرا نام زندہ، زندہ نبی توں تن من واریا ای

سک گئے دریا محبتاں دے بیڑا ریت تے سجناں تاریا ای
اللہ اللہ کہہ کے چڑھیوں دار اتے سروں عشق دا بھارا تاریا ای
تیرے جیہے غازی ورلے ماں جن سی اپنا جنم تے کرم سواریا ای
لاش رہی بے داغ ایمان وانگوں ڈاہڈا جھوٹھ تے سچ فتاریا ای
جنت مانی او پت ترکھان دیا کنڈا کفرا پرادھ دا وڈھیا ای
اشکے بیلیا اوئے تیرے حوصلے توں زندہ پھیر منصور کر چھڈیا ای
دنیا موت کولوں انیویں . بھجدی اے موت عاشقاں دے پردے کجدی اے
اوسے موت نال زندگی سجدی اے جیہڑی موت ہووے کسے چجدی اے[16]

بھگت سنگھ اور اس کے ساتھی

بھگت سنگھ کا نام ۱۹۲۰ء کی دہائی کے وسط میں ابھرا اور گاندھی کی شخصیت کے جال کو توڑتا ہوا پورے ہندوستان پر پھیل گیا۔ اس کا سیاسی ورثہ غدر پارٹی اور نوجوان غدری کرتار سنگھ سرابھا کی شخصیت سے عبارت ہے۔ بھگت سنگھ پہلے اکالی مورچوں کی تحریک سے متاثر ہوا لیکن جلد ہی وہ سکھ مذہب کے معیار سے نکل کر غیر فرقہ وارانہ تنظیم نوجوان بھارت سبھا کا روح رواں بن گیا۔ اس نے پنجاب' بنگال اور یو پی کے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن پارٹی اور ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی تشکیل دی۔ ان نوجوانوں نے سائمن کمیشن کے جلوس پر لاٹھیاں برسانے والے سکاٹ کو قتل کرنے کی کوشش میں' غلطی سے ایک دوسرے افسر کو ہلاک کر دیا۔ اسی طرح انہوں نے ٹریڈ ڈسپیوٹ بل کو منظور ہونے سے روکنے کے لئے مرکزی اسمبلی میں اس احتیاط سے بم پھینکے کہ کوئی ہلاک نہ ہو۔ اس سے قبل ۱۹۲۸ء میں وہ نہرو رپورٹ کو مسترد کر چکے تھے۔ بم پھینکتے ہی انہوں نے ہوا میں پوسٹ اچھالے جن پر لکھا تھا کہ بہرے کو اپنی آواز سنانے کے لئے دھماکے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خود کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا۔ خصوصی عدالت نے بھگت سنگھ اور اس کے دو ساتھیوں کو موت کی

سزا سنائی۔ اسی دوران گاندھی۔ اروِن مذاکرات کے نتیجے میں کانگریسی رہنما اور کارکن رہا کر دیئے گئے لیکن انقلابی نوجوانوں کی سزائیں جوں کی توں قائم رہیں۔ گاندھی جی' ان سزاؤں کی منسوخی کو گاندھی۔ اروِن معاہدے کی ایک شرط بنا سکتے تھے لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا اور بھگت سنگھ کی سزائے موت پر اپنی خاموش رضامندی کی مہر لگا دی۔ بھگت سنگھ کے والد سردار کشن سنگھ نے آخری ملاقات میں بیٹے کو بتایا:

"گاندھی جی نے کہا ہے کہ اگر ان چھوکروں کو پھانسی دینی ہی ہے تو کراچی کانگریس سے پہلے پہلے دے دیں۔ یوں کراچی کانگریس کے پلیٹ فارم سے بھگت سنگھ کی رہائی کے لئے دباؤ کے امکانات پہلے ہی معدوم ہو گئے۔ ۲۳ مارچ ۱۹۳۱ء کو تینوں نوجوانوں کو پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ بہادری اور جرات کے اس کردار نے پورے ہندوستان کو متاثر کیا۔ کراچی کانگریس میں گاندھی کو شدید مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ بھگت سنگھ کی شان میں لوک گیت گائے جانے لگے:

جس رات بھگت سنگھ جمیا

ہور نہ کوئی جمیا

انگریزوں کے سرکاری ریکارڈ میں' ایک ضبط شدہ لوک گھوڑی ملتی ہے جو اس کی پہلی برسی پر کہی گئی تھی۔

یہ گھوڑی ۲۳ مارچ ۱۹۳۲ء کو بھگت سنگھ' راج گورو اور سکھدیو کی پہلی برسی کے موقع پر لاہور میں ایک لوک شاعر (طائر) نے تانگے پر کھڑے ہو کر گائی تھی۔ شہیدوں کی برسی منانے پر حکومت نے مکمل پابندی عائد کر دی تھی۔ لیکن پابندی کے باوجود برسی کی تقریبات میں تقریباً ایک لاکھ افراد شریک ہوئے تھے۔[۱۷]

بھگت سنگھ کے ساتھیوں میں کاکوری سازش مقدمے کے اشفاق اللہ خان اور رام پرشاد بسمل بھی تھے۔ یہ دونوں اردو کے شاعر تھے۔ پھانسی سے پہلے انہوں نے اپنی جو آخری نظمیں لکھیں' وہ آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔ اشفاق اللہ خان کی غزل کا ایک شعر تھا:

کچھ آرزو نہیں ہے' اک آرزو تو یہ ہے

رکھ دے کوئی ذرا سی خاک وطن کفن میں

اسی طرح رام پرشاد بسمل کی غزل کا آخری شعر آج بھی زبان زدعام ہے:

ہم نے جب وادی غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یاد وطن آئی تھی سمجھانے کو

قرارداد پاکستان

۱۹۴۰ء کے ہنگامہ خیز سال میں ۱۹ مارچ سے ۳۱ مارچ تک تین اہم واقعات کا ریکارڈ محفوظ ہے۔ ۱۹ مارچ کو لاہور میں خاکساروں کے جلوس پر گولی چلی۔ ۲۴۔۲۳ مارچ کو قرارداد لاہور (پاکستان) منظور ہوئی اور ۳۱ مارچ کو ایک سکھ اودھم سنگھ نے جلیانوالہ باغ کے سانحہ کے ذمہ دار گورنر پنجاب اوڈائر کو لندن میں قتل کر دیا۔

خاکساروں پر حکومت نے نقل و حرکت کی پابندی لگا رکھی تھی۔ یہی نہیں' حکومت کی طرف سے خاکساروں کو تنگ کرنے کے لئے نئے نئے ہتھکنڈے اور طریقے استعمال کئے گئے تو سالار محاذ خوشحال خاں جدون نے ۳۱۳ جانبازوں کا ایک جیش منتخب کیا۔ یہ جیش ۱۸ مارچ کی شام کو اونچی مسجد اندرون بھاٹی دروازہ پہنچ گیا۔ اس جیش کو ہدایت کی گئی کہ وہ ۱۹ مارچ جمعہ کی صبح کو اونچی مسجد سے شاہی مسجد کی طرف کوچ کریں اور شاہی مسجد میں نماز ادا کریں۔ لاہور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ تھی۔ جلسوں اور جلوسوں پر پابندی عائد تھی لیکن ۱۹ مارچ کی صبح کو ۳۱۳ جانبازوں کا جیش جس کا علمبردار منصور ضیغم بی۔ اے تھا شاہی مسجد کی طرف روانہ ہوا۔ پولیس نے راستہ میں جیش کو روکا' لیکن خاکسار آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ جب یہ جیش تھانہ سی کے قریب پہنچا تو ایک رسوائے عالم پولیس افسر مسٹر بیٹی کی قیادت میں پولیس نے جیش کو طاقت کے بل بوتے پر روکنے کی کوشش کی۔ مسٹر بیٹی اور ایک سالار جیش سید فرمان شاہ کے درمیان تکرار ہو گئی۔ بیٹی بڑا مغرور اور فرعون مزاج پولیس افسر تھا۔ اس نے سالار جیش سید فرمان شاہ کے منہ پر زور کا تھپڑ رسید کیا۔ بس پھر کیا تھا۔ خاکسار اپنے سالار کی توہین برداشت نہ کر سکے۔ ایک بیلچہ بلند ہوا اور مسٹر بیٹی کے رشتہ حیات کو منقطع کرتا ہوا دوسری طرف نکل گیا۔ اب خاکساروں اور پولیس کے درمیان تصادم شروع ہو گیا۔ بیٹی کی موت کے بعد سپرنٹنڈنٹ پولیس مسٹر گیس فورڈ نے پوری طاقت سے خاکساروں کو روکنے کے لئے حملہ کیا لیکن خاکساروں نے اسے بھی بیلچہ پر رکھ لیا اور اسے شدید زخمی کیا اور کئی پولیس والے بھی زخمی ہو کر گرے۔ مسٹر بورن

ڈپٹی کمشنر لاہور' جو گھوڑے پر سوار تھا' یہ صورت حال دیکھ کر بھاگ نکلا۔ اس نے قلعہ میں جا کر پناہ لی اور قلعہ سے دوبارہ بہت بڑی فورس لے کر لوٹا۔ مسلح پولیس نے' جو رائفلوں اور سٹین گنوں سے مسلح تھی' تمام ناکوں اور موڑوں کو روک لیا اور مورچہ بندی کر لی۔ جب خاکسار فوجی پریڈ کرتے ہوئے نوگزے کی خانقاہ کے قریب پہنچے تو ہر طرف سے ان پر آگ برسنی شروع ہو گئی۔ علمبردار منصور ضیغم کو نو گولیاں لگیں لیکن انہوں نے جماعت کے جھنڈے کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ حتیٰ کہ ایک خاکسار جانباز نے آگے بڑھ کر جھنڈا تھام لیا۔ منصور ضیغم نو گولیاں کھا کر جام شہادت نوش کر گئے۔ اس کے بعد پولیس اور فوج نے مکانوں اور دکانوں میں داخل ہو کر خاکساروں کو گھسیٹ گھسیٹ کر باہر نکالا اور گولیوں کا نشانہ بنا دیا۔ مسٹر ویس ڈپٹی انسپکٹر جنرل سپیشل پولیس نے انتہائی وحشت و درندگی کا مظاہرہ کیا۔ پولیس والے خاکساروں کو مکانوں کی چھتوں سے' جہاں لوگوں نے انہیں پناہ دی تھی' اٹھا کر نیچے پھینکتے رہے۔ جب یہ مجاہد اللہ اکبر کا نعرہ لگاتے ہوئے نیچے گرتے تو انہیں گولی مار کر شہید کر دیا جاتا۔ نوگزے کی خانقاہ سے لے کر ناولٹی سینما (سابق گیٹی تھیٹر) تک اور ناولٹی سینما سے لے کر بازار حکیماں کے چوک تک خون انسانی کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔ زخمی کراہ رہے تھے۔ بسمل تڑپ رہے تھے۔ گھوڑ سوار پولیس بے گناہ خاکساروں کی نعشوں کو روند رہی تھی۔

۱۹ مارچ کو انگریز نے جس وحشت و بربریت کا مظاہرہ کیا اور خاکسار مجاہدوں کے خون سے جس طرح ہولی کھیلی' اس کی مثال تاریخ برصغیر میں بہت کم ملتی ہے۔ خاکساروں نے اپنے خون سے ۱۹ مارچ کو قرارداد پاکستان کے لئے روشنائی مہیا کی اور اس امر کا اعلان کیا کہ اس برصغیر میں خاکسار ہمیشہ غلبہ اسلام کے قیام کے لئے قربانیاں پیش کرتے رہیں گے۔ مسلمان اس برصغیر میں اپنے لئے ایک آزاد اور خود مختار وطن لے کر دم لیں گے۔ لاہور کی تاریخ میں ۱۹ مارچ اور ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کے دن تاریخی اہمیت کے حامل ہیں۔

۱۹ مارچ کو انگریز نے خاکساروں کے خون سے لاہور میں ہولی کھیلی اور ۲۳ مارچ کو مسلم لیگ نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی صدارت میں منٹو پارک لاہور میں مسلمانوں کے لئے الگ اور خود مختار وطن کے سلسلہ میں قرارداد پاکستان منظور کی گئی اور مسلمانوں کے لئے ایک الگ آزاد اور خود مختار وطن حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کا آغاز

کیا۔

اس حوالے سے ظہیر نیاز بیگی، استاد کرم، ڈاکٹر فقیر محمد فقیر، استاد عشق لہر اور پنجابی کے کئی دیگر شاعروں نے مسلم تشخص اور مسلمانوں کے جداگانہ وطن کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا لیکن اس کی تفصیل ہم اگلے باب میں بیان کریں گے۔

حوالے

۱۔ دیوی دیال، دیال آچاریہ، راہ نجات، پولٹیکل نظمیں، سیالکوٹ، ت۔ن، صفحہ ۸

۲۔ عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملہ آور، صفحہ ۱۹۱

۳۔ ایضاً، صفحہ ۱۹۵

۴۔ اسد سلیم شیخ، دے دی بار، لاہور، ۱۹۹۷ء، صفحات ۵۰۔۵۱

۵۔ حافظ عبدالحق، فغان ہند در حضور غازی انور پاشا و غازی مصطفےٰ کمال پاشا بگرفتاری آغا محمد صفدر خان، سیالکوٹ، صفحہ ۲

۶۔ ایضاً، صفحہ ۴

۷۔ فضل الٰہی فضل، جوہر لیڈران ہند، لاہور، ت۔ن، صفحات ۲۔۳

۸۔ حافظ عبدالحق، قومی لہراں المعروف پنجابی قومی غزلیں، حصہ دوم، سیالکوٹ، ت ن، صفحات ۳۔۴

۹۔ شرف رچناولی، بھاگ دوجا، صفحہ ۲۹۰

۱۰۔ حافظ عبدالحق، انگریز دا ٹٹو المعروف فوج اور پولیس کی نوکری حرام، سیالکوٹ، ت۔ن، صفحات ۱۔۵

۱۱۔ شہباز ملک، تحریک پاکستان اور پنجابی ادب، لاہور ۱۹۸۳ء، صفحات ۴۰۔۴۱

۱۲۔ ملک لال دین قیصر، جھوک انور، قیصر بک ڈپو، لاہور، ت۔ن، صفحہ ۲، ۳، ۶

۱۳۔ شہباز ملک، تحریک پاکستان.....، صفحات ۴۱۔۴۲

۱۴۔ ایضاً، صفحہ ۴۴

۱۵۔ ایضاً، صفحات ۴۸۔۴۹

۱۶۔ ایضاً، صفحات ۴۹۔۵۰

۱۷۔ احمد سلیم، ہماری سیاسی تحریکیں، لاہور، صفحات ۲۱۳۔۲۱۴

آٹھواں باب

تحریک پاکستان اور پنجابی شاعری

(۱۹۴۰ـ۱۹۴۷ء)

اب یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ پاکستان کا مطالبہ عوام کی تحریک سے کوئی جداگانہ مطالبہ نہیں تھا۔ قائداعظم محمد علی جناح اور مسلم لیگ نے مطالبہ پاکستان کی صورت میں مسلم عوام کی زندہ حقیقت کو پیش کیا تھا اس لئے مسلمان دانشوروں، صحافیوں، وکلا، اساتذہ، حتیٰ کہ دکانداروں اور محنت کشوں تک نے اس مطالبے کی پذیرائی کی۔ شہباز ملک نے اپنی دو کتابوں "تحریک پاکستان اور پنجابی ادب" (۱۹۸۳ء) اور "پنجابی ادب تے منزل پاکستان" (۱۹۹۵ء) میں بڑی تفصیل اور عرق ریزی کے ساتھ وہ تمام شاعری جمع کی ہے جو ۴۷ـ۱۹۴۰ء کے دوران تحریک آزادی کو موضوع بنا کر عوام کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ اس باب میں زیادہ تر حوالے جناب شہباز ملک کی ان دو کتابوں سے ہی اخذ کئے گئے ہیں۔

ظہیر نیاز بیگی کا نام اس ضمن میں اولین نام ہے جنہوں نے تحریک پاکستان کے دوران اردو اور پنجابی میں بہت کچھ لکھا۔ ان کے اپنے بقول

ایک جذبہ تھا جو ان کو ان سات سالوں میں روزانہ کچھ نہ کچھ لکھنے اور کرنے پر مجبور کرتا تھا چونکہ جلسے عام ہوا کرتے تھے ان میں حاضری بھی خاصی ہوا کرتی تھی۔ اسلئے ابلاغ کا کام زبانی ہو جاتا تھا چنانچہ شائع کرنے کا خیال ہی نہیں آیا ان سے جو کلام حاصل ہوا ہے اس کی نوعیت یہ ہے کہ اس میں مسلمانوں کو غفلت کی نیند سے بیدار ہونے کا پیغام ہے مسلم لیگ کی طرف آنے کی تلقین ہے اور پاکستان کے مخالفین کو سختی سے رد کیا گیا ہے۔[1] ملاحظہ فرمائیں مسلم تشخص کو ابھارنے کے لئے ۱۹۴۳ء میں لکھی گئی ایک نظم "جاگ مسلمان" کا ایک حصہ

جاگ مسلمان جاگ ذرا ہن تے اپنیاں اکھاں کھول
حالت تیری ہر اک تھاں دیکھی ڈاہڈی ڈانواں ڈول
اٹھ ہن اپنی سرت سنبھال مولا وقت لیایا اے
فیصلہ تیری قسمت دا تیرے ہتھیں آیا اے
اٹھ ہن پاکستان بنا جے توں زندہ رہنا ایں
دشمن تیرا کل جہاں جھوٹھ نہ میرا کہنا اے
اٹھ اپنے کردار دے نال راضی رب نوں کر لے توں
پھر اس دے انعاماں نال جھولی اپنی بھر لے توں
اس دھرتی دا وارث فیر تینوں رب بنانا ایں
مڑ کے تیرے چمکن دا ہیریا ویلا آؤنا ایں[۲]

کانگرس کی طرف سے "رام راج" کے خواب دیکھنے کا نتارا کرتے ہوئے اپنی بات کو کس طرح منواتے ہیں:

ہن رام راج دی آمد اے، اک باہمن سنکھ وجایا اے
ایہہ دھرتی ہند اے ہندو دی کیوں مسلے رولا پایا اے
ایہہ بھارت ماتا ساڈی اے ہن ساڈا مان سوایا اے
ایس کفر دے چیک چھاڑے نے اسلام دا شیر جگایا اے
کہو لا الٰہ الا اللہ
کہو لا الٰہ الا اللہ

کانگرس کے علاوہ پاکستان کے مخالفین میں سے انگریزوں کے ایجنٹ یونینسٹ بھی تھے ظہیر نیاز بیگی نے ان کو بھی اپنے کلام میں ہاتھوں ہاتھ لیا ہے اس سلسلے میں ایک طویل نظم کا بند ملاحظہ فرمائیں:

کل جیہڑے خون ساڈا وچ وچ پلے نیں

نت جنہاں جسم ساڈے ونڈاں وانگوں رلے نیں
کڈھ کے کلیجے جنہاں پیراں تھلے ملے نیں
اج اوہ دا ربا لاؤن لئی کھلے نیں
ایسے پاروں قوم ساری دیندی پئی دہائی اے
ربا اوہو ڈین ساڈے ویہڑے اندر آئی اے[۳]

مسلم لیگ کی تحریک کے موثر ہونے اور اس کے مخالفین کا حال بیان کرتے ہوئے اپنی ایک نظم میں انہوں نے بڑا اچھا انداز اختیار کیا ہے۔

مسلم لیگ دی اج تحریک کولوں ملکی حاکماں دے دل دھڑکدے نیں
جوئے باز افیمی دی ٹور وانگوں پیروں تھڑکدے تے مونہوں بڑکدے نیں
نعرے حق دے سن کے پٹ اٹھن بدل ا۔لنہاں تے قہر دے کڑکدے نیں
لیڈر قوم دے جدوں بیان دیندے روح ا۔لنہاندے جسم وچ پھڑکدے نیں[۴]

استاد عشق لہر (۱۸۶۹-۱۹۴۸ء) کی شہرت یہ سمجھی جاتی رہی ہے کہ وہ روایتی قسم کے عشقیہ شاعر ہیں۔ اسی حوالے سے استاد عشق لہر کو نظر انداز بھی کیا جاتا رہا ہے لیکن شہباز ملک نے ان کا کلام چھان پھٹک کر ان کے تحریک آزادی کے کردار کو نمایاں کیا ہے۔ ان کی قومی نظموں کی کتاب "نغمہ پاکستان یعنی عشق لہر دیاں لیگی نظماں" ۱۹۴۶ء میں شائع ہو کر ناپید ہو گئی تھی۔ استاد عشق لہر نے پاکستان کو اپنی آنکھوں سے بنتے دیکھا اور ۱۹۴۸ء میں قائداعظم کے ساتھ ساتھ ہم سے جدا ہو گئے۔ ۱۹۴۶ء میں تحریک پاکستان کی حمایت میں وہ گرفتار بھی ہوئے تھے۔ ان کی نظمیں پاکستان کی محبت سے سرشار تھیں اور ان کی شعلہ بیانی مسلم تھی۔ "مطالبہ پاکستان" کو موضوع بنا کر انہوں نے جو نظم لکھی، اس کے دو شعر ملاحظہ ہوں:

مولا کرم کر ہند دے حال اتے مسلمان ایہدا مسلمان ہووے
دلوں کڈھ کدورتاں نوں اک دوسرے توں قربان ہووے

سارے فیصلے ہون قرآن اتے اگے وانگ اسلام دی شان ہووے
عشق لہر کہہ نبی دا واسطہ ای ایس ہند اندر پاکستان ہووے[5]

اس میں پاکستان بنانے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ہے کہ یہ کس واسطے بنایا جا رہا ہے کہ یہاں ایسا دستور ہو گا جس کی بنیاد قرآن حکیم پر رکھی جائے گی۔ دو قومی نظریئے کو عشق لہر نے اپنی ایک نظم "پاکستان" میں بڑے واضح ڈھنگ میں بیان کیا ہے اس میں ہندو کو غیر قرار دے کر فرماتے ہیں:

دل دریا سی دولتاں روڑھدے رہیے ایہہ نہ سوچیا کجھ بچا لیئے
پانی وانگ جنہاں ساڈا مال پیتا ہن اوہ کہن غلام بنا لیئے
سٹی چنگ حریفاں نے وچ گکھاں بھانبڑ بھڑکیا کیویں بجھا لیئے
چڑھیا بحر نفاق دا مار ٹھاٹھاں لاوے ٹھا نہ بہہ بنا لیئے
بیڑی قوم دی اے گھمن گھیر اندر چپہ ونج مہانیوں لا لیئے
غیراں نال نہ نبھدی بھائی والی حصہ اپنا ونڈ ونڈا لیئے
ڈلہے بیراں دا بگڑیا کجھ ناہیں چن کے جے جھولی وچ پا لیئے
عشق لہر سب مشکلاں حل ہوون پاکستان جے کدے بنا لیئے[6]

کانگرس کے خلاف اور قائداعظم محمد علی جناح کے حوالے سے مسلم لیگ کے حق میں بولتے ہوئے جو چومصرعہ لکھا ہے اس کا عنوان ہے "جھوٹی مالا" فرماتے ہیں:

کانگرس بدنامی دا تلک لا کے مالا پائی پھلاندی ڈوڈھیاں دی
موتی، لال، جواہر، زمرد جھوٹھے اہنے کیسھی دی لبھی تے اوڈیاں دی
محمد علی جناح نے باغ لایا جس وچ بڑی ضرورت اے گوڈیاں دی
عشق لہر میدان وچ اوہ نکلی جنہوں کہن جماعت اے ٹوڈیاں دی[7]

قائداعظم محمد علی جناح، عشق لہر کے محبوب رہنما تھے جن کا امیج بنانے کے لئے وہ اپنی شاعری میں جگہ جگہ ان

کے بارے میں عقیدت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہی "قائداعظم" ہے۔ اس میں وہ کانگرسی لیڈروں کا بھی ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قائداعظم کی بھرپور رہنمائی پر کانگرسی لیڈر سٹپٹا اٹھے ہیں اور فتوے لگانے والا (ابو الکلام آزاد) کافروں کے ساتھ مل گیا ہے "سالار کارواں" کے نام سے جو نظم ملتی ہے وہ ملاحظہ ہو:

جیہڑے ماردے سن سانوں آپ مر گئے فیر وی رنگ لا گئی اے مار ساڈی
دکھی دلاں دا حال سناؤ نے نوں بدل چیر کے گئی پکار ساڈی
دریا رحمتاں دا آیا جوش اندر کشتی کس طرح لائی سو پار ساڈی
عشق لہر پہنچائے گا منزلاں تے محمد علی دے ہتھ مہار ساڈی[8]

نغمہ پاکستان میں ان کی تمام نظمیں مسلم تشخص، کانگریسی منافقت اور قائداعظم کی محبت سے بھری ہوئی ہیں مثلاً

چوپٹ وچھی سیاست دی ڈلاں والی شاطر جمع ہو گئے جو بڑے سیانے
پاکستان دی اوہناں نے شرط رکھی جت ہار دا فیصلہ رب جانے
اوہدرلے فریب دی چال والے چال گیر نہ لیگ دے گئے رانے
عشق لہر ڈل سٹے تے پتہ لگا ایہدر پوں باراں اوہدر تن کانے[9]

مولانا محمد بخش مسلم، میراں بخش واقف، سید موسیٰ امرتسری، مولا بخش کشتہ، صحرائی گورداسپوری، فیروز دین فیروز، عبدالغفور اظہر، سید فضل حسین مدنی شہباز، ملک عبدالقادر خوشتر کنجاہی، بابا کمالا، حکیم شیر محمد ناصر، اسمٰعیل متوالا، حاجی چراغ دین اور دائم اقبال دائم سمیت کم و بیش پچاس شعرا نے تحریک پاکستان کے حوالے سے زندہ شاعری تخلیق کی۔ ان کی مندرجہ ذیل نگارشات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ تحریک پاکستان میں پاکستانی شاعری انتہائی غیر معمولی، زندہ اور مجاہدانہ کردار ادا کیا۔ ان میں سے بیشتر قائداعظم اور مسلم لیگ کے جلسوں کی رونق بنے اور ان کے بغیر جلسے مکمل تصور نہیں ہوتے تھے۔

کانگریسی رہنماؤں کی کم نظری اور تنگ نظری کا حوالہ دیتے ہوئے آغا امداد علی خان (۱۹۰۳-۱۹۴۸ء) نے لکھا:

گاندھی نہرو پٹیل دی کم نظری مسلمان تائیں مسلمان کر گئی
میں تے بڑا مشکور ہاں کانگرس دا جس دی تنگ نظری ایہہ سامان کر گئی
آپے پایا پکھنڈ اکھنڈ والا جیہدے نال پیدا پاکستان کر گئی
قہر آلود سی اوہدی نگاہ غالب پر تمنا تے میری جوان کر گئی

اسی طرح محمد دین میر نے یونینسٹ پارٹی کے سر چھوٹو رام کا مضحکہ اڑاتے ہوئے لکھا:

خضر عقل نوں دفن کر قبر اندر ہتھ شیر وی مچھ نوں لان آیا
موئے ہوئے تے قبر کڈھان اپنی ایہہ زندیاں قبر کڈھان آیا
مسلمان تے راگ توحید گاون' چھوٹو رام دے گیت ایہہ گان آیا
ڈین ست گھر چھڈ کے ڈچھ کردی میر گھردیاں نوں خضر کھان آیا

عبدالقادر خوشتر گنجاہی نے خاکسار اور احرار کی کانگریس نوازی پر طنز کرتے ہوئے مسلمانوں کی بیداری کا مژدہ سنایا اور مطالبہ پاکستان کے نعرے کی تائید کی۔

سن او ساد مرادیا مسلمانا اجکل جنگ آزادی وی ہو رہی اے
جیہڑی قوم نوں بہن دی جاچ نہیں سی اوہ بھی اپنی پیریں کھلو رہی اے
کنکوں پھٹ کے جیہڑی گنڈھیل ہوئی کنڈے اپنے لئی اوہ بو رہی اے
خاکساری احراری نہ قوم سمجھیں ایہہ تے غیر دیاں جتیاں دھو رہی اے
جیکر کامل آزادی نوں چاہوندا ایں مسلم لیگ ول تیرا ایمان چاہیدائے
ایہو بول حکومت تے کانگرس نوں ساڈا وکھ بننا پاکستان چاہیدائے

محمد رفیع اختر لاہوری نے اس عزم اور یقین کا اظہار کیا کہ مسلمان غلام نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ قرآن پاک کا فرمان ہے اور قائداعظم کی سچی آواز سن کر مسلمان میدان میں اتر آئے ہیں۔

قائداعظم دی سچی آواز سن کے مسلمان میدان وچ آ گیا اے

پہلا جوش ایمان لے دلاں اندر ہر بے جان اج جان وچ آ گیا اے
پاکستان بننا اے تے ضرور بننا اے آن والا اج آن وچ آ گیا اے
مسلمان غلام نہیں رہ سکدا اختر صاف قرآن وچ آ گیا اے

مولا بخش کشتہ نے قائداعظم کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے لکھا کہ انہوں نے اپنی تدبیر قطرے کو گہر میں تبدیل کر دیا ہے۔

اللہ قائداعظم تے کرے رحمت جنہاں قطریوں موتی بنا دتا
پھسے ہوئے غلامی وچ مومناں نوں ہمت نال آزاد کرا دتا
اساں مورکھاں عقل دے انھیاں نوں راج کرن دا ول سکھا دتا
کشتہ جوڑ کے اوہناں نے ذریاں نوں اک سورج بنا چمکا دتا

حکیم شیر محمد ناصر نے قومی اتحاد کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے لکھا:

فجرے بعد نماز دعا منگی مولا حالتاں دیکھ اسلام دیاں
تینوں پاک محمدؐ دا واسطہ ای کٹ مشکلاں ہندی غلام دیاں
غیبوں آئی آواز کہ جو قوماں تابع حق دے ہین احکام دیاں
مالک ملک دا اوہناں نوں کر دیاں نیں دونویں میماں محمد دے ناں دیاں
ہو کے اک سارے ہندوستان والے حکم حق تے عمل کما لیئے
اوس حافظ ناصر دی مدد کرنی بگڑی اپنی آپ بنا لیئے

اوپر درج کئے گئے کلام کو ایک نظر دیکھنے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پنجابی شاعروں نے تحریک پاکستان کے سات سالہ مختلف مراحل، مسلم لیگ، قائداعظم، خضر حیات کی مسلم دشمنی، کانگریس کے ہندو کردار کے حوالے سے جتنی وضاحت اور درد مندی سے لکھا ہے اس کی بنیاد پر تحریک پاکستان کی شعری تاریخ مرتب کی جا سکتی ہے اور یہ ایک قومی دستاویز سے کم نہ ہو گی۔

حوالے

۱۔ شہباز ملک، تحریک پاکستان اور پنجابی ادب، صفحہ ۹۰

۲۔ ایضاً، صفحہ ۹۱

۳۔ ایضاً، صفحات ۹۱۔۹۲

۴۔ ایضاً، صفحہ ۹۲

۵۔ استاد عشق لہر، نغمہ پاکستان، لاہور، ۱۹۴۶ء، صفحہ ۸

۶۔ ایضاً، صفحہ ۱۷

۷۔ ایضاً، صفحہ ۲۶

۸۔ ایضاً، صفحہ ۲۱

۹۔ ایضاً، صفحہ ۱۴

۱۰۔ ایضاً، صفحہ ۱۳

۱۱۔ ایضاً۔

نواں باب

اختتامیہ

پنجابی شاعری میں تحریک پاکستان کے حوالے سے زیر نظر مطالعہ ہمیں کئی اہم نتائج تک پہنچاتا اور اس مفروضہ نما حقیقت کو مسترد کرتا ہے کہ پنجاب نے تحریک آزادی میں اور پنجابی شاعری نے مزاحمتی تخلیق کے عمل میں حصہ نہیں لیا۔ ہمارے جائزے سے یہ بات واضح ہے کہ ملتان پر انگریزی یلغار اور پنجاب پر انگریزوں کے قبضے (۹-۱۸۴۸ء) سے لے کر قیام پاکستان تک پنجابی شاعروں کی اکثریت نے نہ صرف بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمتی جذبوں کو طاقتور تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا بلکہ کھوکھلے جذبات کی بجائے دلیل اور شعور کی مدد سے عقلی رویوں کا اظہار بھی کیا۔

بحث کا خلاصہ

پہلے باب میں ہم نے دیکھا کہ قدیم ترین زمانوں سے پنجابی شاعری کی روایت حب الوطنی اور مزاحمت کی روایت رہی ہے۔ سب سے پرانے حوالے ہمیں رگ وید کے زمانوں کی شاعری تک لے جاتے ہیں۔ اس دور کے گیتوں میں آریاؤں نے مقامی آبادی یعنی دراوڑوں کے لئے واضح لفظوں میں حقارت کا اظہار کیا ہے۔ سپت سندھو یا سات دریاؤں کی سرزمین' دوسرے لفظوں میں موجودہ پاکستان کے قدیم باشندوں نے آریائی حملہ آوروں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں۔ آریاؤں اور دس مقامی سرداروں کے درمیان جنگ کے علاوہ' رگ وید میں اس جنگ کا ذکر بھی ملتا ہے جو ہری یوپا (موجودہ ہڑپہ) میں ہوئی اور جس کا فیصلہ بدقسمتی سے آریاؤں کے حق میں ہوا۔ چنانچہ یہ نکتہ ہاتھ آتا ہے کہ رگ وید کے گیت پنجاب کے مختلف علاقوں میں آریاؤں کے خلاف دراوڑ مزاحمت کے ذکر سے بھرے پڑے ہیں۔

پھر سکندر مقدونی تک پنجاب پر بیرونی حملوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ حملہ آور ملکوں میں مصر، شام اور ایران قابل ذکر ہیں۔ سکندر کے حملے کے حوالے سے جو تاریخ مرتب ہوئی ہے، وہ متعدد تاریخی غلط بیانیوں اور مغالطوں سے بھری پڑی ہے۔ پہلے باب میں ہی ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں کامیاب رہے کہ پنجاب میں پورس کے خلاف سکندر کی کامیابی ہی دراصل اس کی ناکامی تھی اور اہل پنجاب کی یہی مزاحمتی لڑائی تھی جس نے آخرکار سکندر کو اخلاقی اور جسمانی طور پر پسپا ہونے پر مجبور کیا حتیٰ کہ اسے وطن واپس پہنچنے سے پہلے ہی موت نے آن دبوچا۔ ہم نے اس نکتے کو وضاحت سے بیان کیا ہے کہ پنجاب کی اس مفروضہ ناکامی میں بھی دراصل ٹیکسلا کے راجہ کی غداری کا عمل دخل تھا جس نے پورس سے دشمنی کو، پنجاب سے دشمنی میں بدل دیا۔

اسی باب میں ہم نے ناتھ جوگیوں کی سماجی بغاوت کے ذکر سے یہ اخذ کیا کہ ناتھ شاعری سماجی احتجاج کے ساتھ ساتھ انسانی شخصیت کے داخلی اور خارجی تصادم کو بھی واضح کرتی ہے۔ اسی طرح راجہ رسالو کی مہمات سماجی انصاف کے لئے ظلم کے خلاف پنجابی مزاحمت کا واضح اظہار ہیں۔ بارہویں سے انیسویں صدی تک پنجابی تصوف کے وحدت الوجودی اور مزاحمتی رویئے بابا فرید سے خواجہ فرید کی شاعری تک میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ سولہویں صدی میں شاعر مادھو لعل حسین، کسان انقلابی رہنما دلا بھٹی کی زبان تھا۔ بابا فرید کے دور میں منگول حملوں کے خلاف مزاحمت سے لے کر بابر کے حملے تک اور پھر اٹھارہویں صدی میں نادر شاہ اور احمد شاہ درانی کے حملوں کے خلاف پنجابی مزاحمت، ان صدیوں کے ایک ایک ورق پر لکھی ہوئی نظر آتی ہے۔

۱۸۳۹ء تا ۱۸۴۹ء کے دور میں دم توڑتی ہوئی پنجابی ریاست اور اسے بچانے کے لئے ملتان، گجرات اور لاہور میں پنجابیوں کی مزاحمت اسی روایت کا تسلسل ہے، جس کا ذکر پہلے باب میں ہم نے تفصیل سے کیا اور اس کی نئی تفصیلات دوسرے باب میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ دوسری اینگلو۔ پنجابی جنگ میں پنجابی شاعر شاہ محمد نے کھل کر ایک طرف پنجابی قومیت کی بات کی تو دوسری طرف انگریزی سامراج سے اپنی کھلی نفرت کا اظہار بھی کیا۔ وہ دکھ اور اداسی کے لہجے میں لکھتا ہے:

مٹھی میٹی سی ایس پنجاب دی جی

ایہناں کھول دتا اج پاج یارو

اسی طرح پنجابی کی لوک روایات، خصوصاً اس دور میں گائے جانے والے ڈھولوں سے بھی پنجابی مزاحمت کی روایت کا اظہار ہوتا ہے۔ کم و بیش اسی عہد میں ملتان کی انگریزوں کے خلاف عوامی بغاوت بھی اسی روایت کا تسلسل ہے۔

تیسرے باب میں ہم نے پنجاب کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کی جنگ ازادی کا محاکمہ کیا ہے اور دکھانے کی کوشش کی ہے کہ پنجابی عوام نے اس موقع پر بھی غیرملکی حکمرانوں کے خلاف مزاحمتی جنگ لڑی۔ انگریزی رپورٹوں میں پنجاب میں جگہ جگہ بغاوت پھوٹ پڑنے کی دہائی دی گئی ہے۔ احمد خان کھرل اس دور کا سب سے بڑا پنجابی ہیرو ہے جو اپنے متعدد ساتھیوں کے ساتھ انگریزوں کو پنجاب سے نکالنے کے لئے سرگرمی سے لڑا اور بالاخر شہید ہوگیا۔ اس کی یاد میں سیکڑوں نہیں، ہزاروں ڈھولے آج بھی ہماری لوک روایت کا حصہ ہیں۔

چوتھا باب انیسویں صدی کے نصف آخر کی مزاحمتی داستان ہے جس میں پنجابی کی تمام قوموں نے اپنی سماجی اور سیاسی تحریکوں کے ذریعے صدیوں پرانی مزاحمتی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کہانی میں کوکا یا نامدھاری نمایاں رہے۔ پانچویں باب میں بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیوں میں بار کے کسانوں کی بغاوت ہوئی (۹-۱۹۰۷ء)، انقلابی ادب کی ضبطیاں ہوئیں، غدر پارٹی (۱۹۱۳ء) وجود میں آئی۔ پنجابی ماہنامہ "غدر گونج" میں چھپنے والی شاعری نے مزاحمتی روایت کو آگے بڑھایا۔ چھٹا باب پہلی عالمی جنگ کے دوران پنجاب میں فوجی بھرتی کے خلاف پنجابی عوام کی مزاحمت سے ہوتا ہے کہ پنجاب کے چپہ چپہ پر بھرتی کے خلاف مزاحمت ہوئی۔ اس دور کے پنجابی لوک گیت، ماؤں کی اپنے بیٹوں اور دوشیزاؤں کی اپنے محبوب جوانوں کے لئے تڑپ اور پکار، بھرتی سے ان کی نفرت کا اظہار کرتی ہے۔ ۱۹۱۹ء میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام کا سانحہ پیش آیا جس کا ذکر اسی باب میں ملتا ہے۔ اس سانحہ سے متعلق پنجابی شاعری نے مزاحمت کی نئی روایات کو جنم دیا۔ حکیم عبدالطیف، نانک سنگھ اور بابو فیروز دین شرف اس موضوع پر لکھنے والے اہم شعراء تھے۔

ساتواں اور آٹھواں باب پنجابی شاعری کے حوالے سے ان تحریکوں کا احاطہ کرتے ہیں جو ۱۹۲۰ء سے ۱۹۴۷ء کے

درمیان پنجاب میں پیدا ہوئیں اور پروان چڑھیں۔ ان میں ہجرت' خلافت' ترک موالات' بھگت سنگھ کی انقلابی تحریک اور مسلم لیگ کی تحریک شامل ہیں۔ یہ تمام تحریکیں اس دور کے پنجابی شاعروں کی تخلیقی کاوشوں کا موضوع بنیں جن سے ہمارے اس نکتے کی تصدیق ہوئی کہ حب الوطنی اور آزادی کی روایت' پنجابی شاعری سے اس طرح جڑی ہوئی ہے کہ انہیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

پنجابی روایت اور پاکستان کی دیگر زبانیں

یہاں مناسب ہو گا اگر ہم پنجابی روایت کے ساتھ ساتھ سندھی' بلوچی اور پشتو کی مزاحمتی روایات کا بھی ذکر کریں۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ صفحات میں ذکر کیا ہے کہ وادی سندھ یا سپت سندھو کی سرزمین دراصل موجودہ پاکستان ہی ہے جو وادی گنگ و جمن یا شمالی اور جنوبی ہند کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں اپنا جداگانہ تہذیبی اور تاریخی تشخص رکھتا ہے۔ مزاحمتی روایات کا ورثہ پاکستان کے تمام صوبوں میں مشترکہ ہے۔ ان تمام علاقوں نے یکساں طور پر بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت کی اور آزادی کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

سندھی شاعری کی بدھ روایات' ابتدائی اسماعیلی اثرات' سمہ اور سومرہ دور کی خود مختار سندھی ریاست' مغلوں کے خلاف شاہ عنایت شہید کی کسان تحریک جو ۱۷۱۷ء میں مائی بختاور نامی ہاری خاتون کی شہادت تک پھیلی ہوئی ہے[1] ان سب کا تعلق اسی مزاحمتی روایت سے ہے جس کا ذکر ہم پنجاب کے ضمن میں کر آئے ہیں۔ آزادی سے قبل سندھی شاعر شیخ ایاز نے بغاوت اور انقلاب کے مزاحمتی گیت تخلیق کئے۔[2] اسی طرح بلوچستان میں میر چاکر رند کی بغاوتیں اس روایت کو انگریزی عہد تک آگے بڑھاتی ہیں۔ تحریک آزادی کے آخری دور میں گل خان نصیر نے اپنی بلوچی شاعری کے ذریعے اپنے مزاحمتی رویوں کا اظہار کیا۔[3] پشتو زبان و ادب بھی اس روایت کا امین رہا ہے۔ ابتدائی مغل عہد میں بایزید انصاری یا پیر روشان کی رہنمائی میں کسان نے بغاوت کا علم بلند کیا۔ بایزید انصاری کا خاندان پانچ پشتوں تک اس بغاوت کی سرکردگی کرتا رہا۔ اکبر کے عہد میں بایزید کے بیٹوں نے یہ سلسلہ جاری رکھا۔ بغاوت کو مکمل طور پر شاہجہان کے عہد میں کچلا جا سکا۔ بایزید انصاری' پشتو' ہندکو' فارسی اور عربی کا شاعر اور وحدت الوجودی

صوفی تھا۔ اس روایت کو اورنگ زیب کے عہد میں خوشحال خان خٹک نے آگے بڑھایا۔[۴] پھر یہ سلسلہ قیام پاکستان تک چلا اور متعدد پشتو شاعروں نے، تحریک آزادی اور قیام پاکستان کی جدوجہد کو اپنے کلام کا موضوع بنایا۔

اس اعتبار سے موجودہ پاکستان کے تمام صوبوں، یا وادی سندھ کے علاقوں کے شعراء ایک ہی روایت میں جڑے ہوئے ہیں اور بیرونی حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت سے لے کر برصغیر میں ہندو تسلط کے خلاف تہذیبی اور تخلیقی صف بندی تک انہوں نے انتہائی اہم اور تاریخی کردار ادا کیا ہے۔

اردو شاعری کا کردار

ہم دیکھتے ہیں کہ پنجاب میں جب شاہ محمد انگریزی راج کے خلاف اپنا رزم نامہ لکھ رہا تھا، شمالی ہندوستان کے مراکز دہلی اور لکھنؤ میں اردو شاعری انحطاط اور انفعالیت کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کے سرنگوں ہوتے ہیں، اردو کے انتہائی روشن خیال، رجائیت پسند اور جدید احساسات کے حامل شاعر مرزا غالب کو بھی اپنی وفاداریاں تبدیل کر کے انگریزی اقتدار کا قصیدہ خواں بننا پڑا اور مجاہدین آزادی کی انگریز دشمنی پر لعن طعن کرنا پڑی تھی۔ پنجاب کی جن ریاستوں (مثلاً پٹیالہ) نے ۱۸۵۷ء میں انگریزی حکومت کی تائید و حمایت کی تھی، غالب نے اسی مہاراجہ پٹیالہ کی قصیدہ خوانی بھی کی تھی۔ غالب کا طویل فارسی روزنامچہ "دستنبو" آزادی کے متوالوں کو غدار، ولد الزنا، خنزیر اور اسی جیسے دیگر القاب سے نوازتا ہے۔[۵] انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل تک اردو شاعری کے موضوعات انگریز دشمنی کے جذبات سے یکسر عاری نظر آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ دو روایتیں، ایک دوسری کی مخالف سمت میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ پنجابی اور دیگر مقامی زبانوں کی روایت حب وطن اور مزاحمت کی روایت تھی جبکہ اردو شاعری، روایتی موضوعات یعنی موضوعی داخلیت اور کھوکھلی خارجیت کے درمیان معلق تھی اور اس کو اپنے اردگرد زندگی کی اکھاڑ پچھاڑ کا اندازہ اور احساس نہیں ہو رہا تھا۔۔۔[۶]

اردو شاعری نے اقبال کی صورت میں ایک نئی کروٹ بدلی۔ اقبال اگرچہ اردو اور فارسی میں شعر کہتے تھے لیکن وہ اس پنجابی روایت کا مربوط تسلسل تھے جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر چکے ہیں۔ اقبال کی صورت میں اردو

شاعری کو ایک نئی رجائیت' ایک نیا طرز احساس نصیب ہوا۔ علی گڑھ کی روایت کے برعکس اقبال کا رشتہ غلامی کے خلاف مقامی روایت سے جڑا ہوا نظر آتا ہے۔

بیسویں صدی کے ابتدائی تیس چالیس برسوں میں اقبال کا نام اور کلام مزاحمت اور حریت فکر کا دوسرا نام ہے۔ اس روایت کی تقلید میں ہمیں دوسرا اہم نام مولانا ظفر علی خان کا نظر آتا ہے۔ ظفر علی خان کی "جسیات" اور دوسرا باغیانہ کلام اقبال کی روایت کا ہی امین ہے۔

اسس دور میں شمالی ہندوستان سے صرف ایک نام--- مولانا محمد علی جوہر--- کا نام اس روایت سے جڑا ہوا محسوس ہوتا ہے لیکن ان کی سیاسی سرگرمیاں' ان کی شاعرانہ اور تخلیقی طبع پر حاوی نظر آتی ہیں۔ اسی طرح رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی' اپنی صحافت میں انتہائی شدت پسند اور انقلابی نظر آتے ہیں لیکن ان کی شاعری تغزل کی روایت اور۔

چپکے چپکے رات دن آنسو بہانا یاد ہے

سے آگے بڑھتی نظر نہیں آتی۔

بیسویں صدی کی تیسری اور چوتھی دہائی میں جوش ملیح آبادی اپنی' سامراج دشمن انقلابی شاعری کے باعث بجا طور پر "شاعر انقلاب" کہلانے کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ انہوں نے برصغیر پاک و ہند کی تمام انقلابی تحریکوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ بھگت سنگھ کے حوالے سے ایک نظم میں انہوں نے لکھا تھا:

بھگت کو اس لئے مارا کہ جینا چاہتا تھا وہ
وطن کے دشمنوں کا خون پینا چاہتا تھا وہ

اسی دور میں اقبال کی تقلید میں سندھ' بلوچستان اور سرحد کے چند کم معروف اردو شعراء نے بھی تحریک آزادی کے حوالے سے قابل قدر شاعری کی ہے اور یہ شاعری اس پنجابی روایت کا حصہ ہے جو ہمارے اس تحقیقی مقالے کا موضوع ہے۔

حوالے

۱۔ انٹرویو، احمد سلیم

۲۔ ایضاً۔

۳۔ انٹرویو، واحد بخش بزدار

۴۔ انٹرویو، امجد علی

۵۔ احمد سلیم، آزادی اور عوام، صفحہ ۴۰

۶۔ انٹرویو، احمد سلیم

طائر

بھگت سنگھ کی گھوڑی

آنی بھیو آؤ رل گاویئے گھوڑیاں
جنج تے ہوئی اے تیار، وے ہاں
موت کڑی نوں پرناون چلیا
دیش بھگت سردار وے ہاں
پھانسی دے تختے والا کھارا بنا کے
بیٹھا توں چونکڑی مار وے ہاں
ہنجھواں دے پانی بھر نہاوو گھڑولی
پھانسی دی ٹوپی والا کھارا بنا کے
سہرا توں بدھا جھانجر دار وے ہاں
جنڈی تے وڈھی، لاڑے زور ظلم دی
صبر دی مار، تلوار وے ہاں
راجگورو تے سکھدیو سربالے
چڑھیا تے توں ہی وچکار وے ہاں
واگ پھڑائی تیتھوں بھیناں نے لینی
بھیناں دا رکھیا ادھار وے ہاں

ہری کرشن تیرا بنیا وے سانڈھو
ڈھکے تے سیں اکو وار وے ہاں
پیستی کروڑ تیرے جانجی وے لاڑیا
پیدل تے کئی اسوار وے ہاں
کالیاں پوشاکاں پا کے جنج جو ٹر پئی
طائر وی ہویا اے تیار وے ہاں

ضمیمہ ۲

استاد عشق لہر

جس چمن دا ہووے جناح مالی اوہ چمن برباد نہیں ہو سکدا
بلبل وانگ عاشق اپنے گلاں دا اے کدے عاشق صیاد نہیں ہو سکدا
جیکر رائی دا بنے تربوز ناہیں ایویں کانا شمشاد نہیں ہو سکدا
طوطا کسے توں سکھ کے کرے گلاں پر اوہ طوطا استاد نہیں ہو سکدا
عشق لہر جو قوم غلام کردا اوہ آپ آزاد نہیں ہو سکدا

اج میں نویں سناواں گا دوستاں نوں جو مراد ساڈے پاکستان دی اے
ملک وکھرا بنے تے ویکھ لینا کرنی حکمرانی بڑی شان دی اے
تے اقلیتاں دا حق محفوظ کر کے خیر منگنی اوہناندی جان دی اے
عشق لہر محمدی لاء ہوسی گل منی پاک قرآن دی اے

ضمیمہ ۳

مولانا محمد بخش مسلم

جیوندی جان اوہ پیاریا علم دینا جیون جوگیا موت نوں ماریا ای
جگاں تیک رہسی تیرا نام زندہ، زندہ نبیؐ توں تن من واریا ای
سک گئے دریا محبتاں دے، بیڑا ریت تے سجناں تاریا ای
الا اللہ کہہ کے چڑھیوں دار اتے سروں عشق دا بھار اتاریا ای
تیرے جیہے غازی ورلے ماں جن سی اپنا جنم تے کرم سواریا ای
لاش رہی بے داغ ایمان وانگوں ڈاہڈا جھوٹھ تے سچ نتاریا ای
جنت مانی اوپت ترکھان دیا کنڈا کفر اپرادھ دا وڈھیا ای
آئی موت حیات دا جام لے کے مکھ بچیاں وانگ چا اڈیا ای
اشکے بیلیا اوئے تیرے حوصلے توں زندہ پھیر منصور کر چھڈیا ای
دنیا موت کولوں انیویں ۔ بھجدی اے موت عاشقاں دے پردے کجدی اے
اوسے موت نال زندگی سجدی اے جیہڑی موت ہووے کے چجدی اے

ضمیمہ ۴

محمد دین میر

منہ کچھاں چ پا کے حیاروندی کہندی خضر نے شرافت دا لاہیا لنگوٹا
اوہ سونا کھرا جو بظاہر سی دسدا کسوٹی تے لایا تے دسیا اوہ کھوٹا
شہیداں دی ہڈیاں تے زینے بنا کے اسمبلی چ پہنچا اوہ ڈیلو تے موٹا
یونینسٹ دی میر آوی چ چڑھکے رہیا پھر وی پلا تے بوڑا ای لوٹا

ضمیمہ ۵

سید فضل حسین مدنی شہباز

کدی سوچیا ای غافل مسلمانا تیری شان تے تیری اوہ آن کتھے
تیری جرات تے غیرت نوں کیہ ہویا اج گیا ہے تیرا ایمان کتھے
کتھے گیا جذبہ تیریاں بزرگاں دا تے تیری عقل نوں آن کے کیہ ہویا
پھیریں عشرتاں عیشیاں توں کردا' تیریاں حکمتاں دا قلمدان کتھے
چھڈی خودداری وڈھی پئی خواری نالے گئی امارت لگی ضرب کاری
ورثے وچ سی تیرے جو ہتھ آیا اج دس کھاں اوہدا نشان کتھے
تینوں رہی ناہیں ذرا مول غیرت پتہ نہیں حمیت نوں کیہ ہویا
پھریں جھکدا غیراں دے چاؤڑ اتے وفاداری دا عہد پیمان کتھے
کتھے گئی تیری ایڈی بادشاہی گکھاں نالوں وی پھریں توں اج ہولا
اوہ پیغام جیہڑا نبی پاک دتا' دس کھاں سود اوہدا تے زیان کتھے
تیری شان سی دنیا تے بھائی میرے آیوں ہورناں آزاد کران لئی
رہنا ایں وچ غلامی دے شاد ہر دم اوئے بے غیرتا گیا قرآن کتھے
توں خیال کریں اپنیاں بھائیاں دا جیکر رب تینوں نکر دیوندا اے
کر پالنا اپنے سنگیاں دی کتھے توں تے تیرا جہان کتھے
چھڈ غفلتاں بھائیاں نال اک ہو کے ایس ویلڑے نوں ذرا سمجھ جائیں
تیری قوم دے سرے تے کیہ بن گئی ذرا سوچ کھاں تیرا دھیان کتھے

اوئے ایہہ کانگرس، ہندو، احرار بھائی نالے تیرے غدار بھرا سارے
چٹے منہ والے انگریز جیہڑے لگے کرن نیں تینوں ویران کتھے
تینوں کردے رہے خراب اگے ہن نواں طوفان اٹھا لیا نیں
ذرا سنبھل جا بھائیا مسلمانا! لگے کرن نی تینوں قربان کتھے
آ جا پھڑ رسی مسلم لیگ والی قائداعظم جناح دے نال رل کے
ڈبی بیڑی ترا لے فیر اپنی نکھر گیوں توں وچ غلطان کتھے
عاشق وانگ بلال دے بن پکا حیدر جیہا جذبہ فیر کر پیدا
حر جیہا توں صدق صفا دل بن، خالد جیہا کوئی لیا جوان کتھے
رل قوم دے نال تے قوم نہ چھڈ قوم قوم دا بھلا اج چاہوندی اے
ہو جا مثل پتنگ نثار اس پر آیا سرے تے جھل طوفان کتھے
پاکستان لینا اسیں ہر قیمت بھاویں دنیا دے وچ فنا ہوئیے
شہباز تیرے ایہو رہے لچھن فیر توں کتھے پاکستان کتھے؟

ضمیمہ ۵

صحرائی گورداسپوری

مجاہداں دا ماہیا

اللہ کرم کماوے گا
دیری بھاویں کجھ وی کرن پاکستان مل جاوے گا

خوف کسے دا نہ سی کھاؤ
یونینسٹاں دے سامنے سینہ تان کے ڈٹ جاؤ

کانگرس دا بھانڈا بھجیا
مسلم لیگ والا سارے جگ وچ ناں گجیا

اسی نبی دے آں دیوانے
ساڈیاں ہمتاں نوں ازلاں توں جگ جانے

پاکستان لئی ساہ ساڈے
جیلاں انگریز دیاں ڈک سکن نہ راہ ساڈے

سن گاندھیا پٹیلا سن
تہاڈیاں چھاتیاں اتے اساں ولنا ایں ولیا ہن

اساں مقصد پا لینا
کانگرس پٹدی رہوے پاکستان بنا لینا

ضمیمہ ۶

بابا کمالا (حافظ عبدالرحمٰن)

سیاسی کبڈی

اکھاڑا بنیا وائسرائے دی کوٹی　　بڑی اچھی تھاں یعنی شملے دی چوٹی
اوہدھر گاندھی جی آئے بنھ کے لنگوٹی　　جناح لا کے ٹائی بڑی ٹھاٹھ کڈھی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

کدی اگے پچھے کدی سجے کھبے　　پٹیل اتے نہرو بڑے نسے بھجے
پھڑائی نہ دتی جناح تیرے بلے　　کتے ٹھپی ماری کتے چاٹ چھڈی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

بڑے کانگرسیاں نے چکر چلائے　　روپے پیسے مکھڑے دے جلوے دکھائے
کئی مولوی نال اپنے ملائے　　مگر لیگ نے جڑھ سبھناں دی وڈھی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

کبڈی دا منصف بنیا لارڈ ویول　　ہدایت اوہ لیندا سی لندن توں پل پل
سکھاندا سی کرتب اوہنوں سارے چرچل　　بڑی کھاہدی گورے نے لالے توں وڈھی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

کبڈی　کبڈی　دیر　ہوئی　　جناح والی ڈھانی بڑی شیر ہوئی
ہنومان دی سینا ڈھے ڈھیری ہوئی　　جناح نے ڈویژن کرا کے ای چھڈی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

ضمیمہ ۷

سید موسیٰ امرتسری

سیاسی کبڈی

میرا ہانی آ کے جو شیطان ہویا　　کبڈی والا ایہہ فیر سامان ہویا
بڑے معرکے دا سی سامان ہویا　　تے پالے دے وچکاروں اک لیک کڈھی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

جناح نے جو گاندھی نوں آ ہتھ پایا　　سیاست دا سب تانا بانا بھلایا
جدوں لیگ نے اپنا چرخہ چلایا　　رہی کانگرس نہ رہی کوئی کھڈی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

جو موسیٰ نے لاحول دی دھول ماری　　تے مونڈھے تے اوہدے اوہ لگی کراری
گیا چھڈ پالا ہوئی اوہنوں خواری　　لیا مار تے روز دی دو وڈی
کبڈی　کبڈی　کبڈی　کبڈی

ضمیمہ ۸

امام دین مجاہد

مسلم لیگ

مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاء اللہ قوم دی بیڑی یارو بنے لاوے گی
ایہہ گل میری سنو بھراؤ مسلم لیگ دا ساتھ نبھاؤ
سارے مل کے زور لگاؤ ہمت رنگ لیاوے گی
مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاء اللہ قوم دی بیڑی یارو بنے لاوے گی
ایہہ گل میری بھ لو پلے کلے دی کوئی پیش نہ چلے
مسلم لیگ دے جھنڈے تھلے وگڑی راس ہو جاوے گی
مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاء اللہ قوم دی بیڑی یارو بنے لاوے گی
اٹھو جاگو کریئے چارا جاگ پیا اے عالم سارا
مسلم لیگ دا سن کے نعرہ جان ویری دی جاوے گی
مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاء اللہ قوم دی بیڑی یارو بنے لاوے گی

اک مٹھ ہو کے مسلم بھائی سوچو سمجھو کرو دانائی
جیکر ایہہ وی گھڑی کھنجائی مڑ کے ہتھ نہ آوے گی

مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاء اللہ قوم دی بیڑی یارو بنے لاوے گی

چمکے دین اسلام اساڈا دنیا اتے نام اساڈا
پورا حق امام اساڈا ساڈے پلے پاوے گی

مسلم لیگ جماعت پیاری کیتے قول نبھاوے گی
انشاء اللہ قوم دی بیڑی یارو بنے لاوے گی

کتابیات

پنجابی، اردو کتب

—— احمد سلیم، پنجابی ادب ایک سوالیہ نشان، کراچی، ۱۹۸۶ء

—— احمد سلیم، پنجاب (پنجابی)، رچناب پبلشرز، گوجرانوالہ، ۱۹۷۰ء

—— احمد سلیم، لوک واراں، اسلام آباد، ۱۹۷۱ء

—— احمد سلیم، آزادی اور عوام، لاہور، ۱۹۹۰ء

—— احمد سلیم، ہماری سیاسی تحریکیں، لاہور

—— احمد غزالی، ساندل بار، فیروز سنز، لاہور

—— اسد سلیم شیخ، دلے دی بار، لاہور، ۱۹۹۷ء

—— استاد عشق لہر، نغمہ پاکستان، لاہور، ۱۹۴۶ء

—— میاں اللہ دتہ سلیم سیمی، تاریخ دیپالپور، لاہور، ۱۹۹۳ء

—— اقبال اسد، پنجاب دے لجپال پتر، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۹۵ء

—— اے ڈی اعجاز، کال بلیندی، پاکستان پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۸۶ء

—— محمد آصف خان (مرتب)، جنگ ہند پنجاب، لاہور

—— پریتم سنگھ کیسبو، ضبط شدہ پنجابی کوتا، دلی، ۱۹۹۶ء

—— دیوی دیال، دیال آچاریہ، پولٹیکل نظمیں، سیالکوٹ

—— رشید نثار (مرتب)، وادی پوٹھوہار، راولپنڈی، ۱۹۹۵ء

—— سمیع اللہ قریشی، سرزمین جھنگ، آثار و ثقافت، لاہور، ۱۹۹۸ء

—— شفقت تنویر مرزا، تحریک آزادی تے پاکستان وچ پنجاب دا حصہ، پنجابی ادبی بورڈ، لاہور، ۱۹۹۳ء

—— شہباز ملک، تحریک پاکستان اور پنجابی ادب، لاہور ۱۹۸۳ء

—— عزیز ملک، پوٹھوہار، لوک ورثہ، اسلام آباد، ۱۹۸۷ء

—— عزیز الدین احمد، پنجاب اور بیرونی حملہ آور، لاہور، ۱۹۹۰ء

—— منشی عبدالرحمان خان، تاریخ ملتان ذیشان، ملتان، ۱۹۸۵ء

—— عمر کمال خان (مرتب)، ملتانی واراں، ملتان، ۱۹۹۱ء

—— فضل الٰہی فضل، جوہر لیڈران ہند، لاہور

—— ڈاکٹر فقیر محمد فقیر (مرتب)، سکھاں دی وار، پنجابی ادبی اکیڈمی، لاہور

—— قریشی احمد حسین قلعداری، گجرات بعہد قدیم و جدید، گجرات، ۱۹۶۸ء

—— ملک لال دین قیصر، جھوک انور دی، قیصر بکڈپو، لاہور

— مقبول حسین بھٹی، آئینہ جہلم، جہلم

English Books

— Deewana, Mohan Singh, History of Punjabi Literature.

— Kohli, Dr. Surrinder Singh, History of Punjabi Literature, Delhi: 1997.

— Malik, Fateh Mohammad, Punjabi Identity, Lahore:

— Mirza, Shafqat Tanveer, Resistance in Punjabi Poetry, Lahore.

— Sere brayakov, Punjabi Literature, Moscow: 1968.

— Swynnerton, Romantic Tales from the Punjab.

— Singh, Ganda (ed), Seditious Literature in the Punjab, Patiala: 1988.

Pamphlets, Journals, Newspapers, Reports

— Bombay Chronicle, November, 1923

— Daily "Nation", Lahore, November, 1923

— Karl Marx, Notes on Indian History, Moscow, P.N.D.

— War Services of D.G. Khan, Lahore, 1918.

— War Services of Shahpur District, Lahore, 1918.

اردو، پنجابی

—— پریتم سنگھ کیسبو، سوتنترتا سنگرام دی پنجابی کوتا (کھوج درپن)، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرتسر، فروری ۱۹۸۲ء

—— شرف رچنا ولی (بھاگ دوجا)، پٹیالہ، ۱۹۷۲ء

—— حافظ عبدالحق، فغان ہند حضور غازی انور پاشا و غازی مصطفےٰ کمال پاشا بگرفتاری آغا محمد صفدر خان، سیالکوٹ

—— حافظ عبدالحق، قومی لہراں المعروف قومی غزلیں، سیالکوٹ

—— حافظ عبدالحق، انگریز دائٹو المعروف فوج اور پولیس کی نوکری حرام، سیالکوٹ

—— "غدر گونج"

—— ہفت روزہ "لیل و نہار"، لاہور، مئی ۱۹۵۷ء

—— نانک سنگھ، خونی وساکھی

انٹرویوز

—— احمد سلیم، ایس ڈی پی آئی، اسلام آباد

—— امجد علی طوری، پاراچنار

—— حیات ڈھاڈی، محلہ مسجد عالم شاہ، پنڈ دادنخان

—— عمر ڈھاڈی، مشین محلہ، جہلم شہر

—— پروفیسر واحد بخش بزدار، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد